

یہ بیلین یہ قتلیاں



فہرست

صفحہ نمبر

7	قصہ ایک محبت کا	✽
17	خواہشوں کی تتلیاں	✽
42	دل کا مقدمہ ہار کر	✽
71	تو بسمہ کیوں مرتی؟	✽
89	چاندی دلہن	✽
110	جنت دوزخ	✽
115	خدمت	✽
133	یہ بلبلیں یہ تتلیاں	✽
153	ایسی عورت	✽
162	Fantasy	✽
176	پرکئی	✽
183	تم بھی تو یہی کرتے	✽

قصہ ایک محبت کا

معصومہ کو جب میں پہچاننے لگا تو میرے دل میں اسے جاننے کی خواہش ابھرنے لگی اور مرد کے دل میں جب کسی عورت کی کھوج ابھرے تو وہ اسے بنا وقت ضائع کئے محبت کا نام دے ڈالتا ہے حالانکہ محبت تو اس دنیا کا سب سے مشکل کام ہے۔ اگر محبت کرنا اتنا ہی آسان ہوتا تو کیا خدا جنت جیسی قیمتی شے کے بدلے بندوں سے ان کی کچی محبت طلب کرتا؟

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ مجھے جب معصومہ کی کھوج لگی تو میں اسے محبت سمجھنے لگا۔ وہ کہاں رہتی ہے کیا کرتی ہے کیسے بولتی ہے اور کیا سوچتی ہے؟ مجھے ان سب باتوں کی کھوج رہنے لگی۔ میں اس کا منتظر رہنے لگا اور ایک وقت مقررہ پر اس کو دیکھنے کا عادی ہو گیا اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ ان باتوں سے مرد محض یہی نتیجہ اخذ کر پاتا ہے کہ اسے اس عورت سے محبت ہو گئی ہے۔ لہذا میں نے خود کو چاندنی راتوں میں اپنے گھر کے سونے صحن میں بیٹھ کر بارہا یہ یاد کر لیا کہ میں معصومہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔ حالانکہ یہ تو محض سفر کا آغاز تھا اور محبت کی پرکھ تو سفر کے اختتام سے وابستہ ہے۔

میں ان دنوں نیا نیا روزگار سے لگا تھا اور اپنی تنخواہ بڑھوانے کے چکر میں مزید ڈگریوں کا حصول چاہتا تھا۔ اگلے امتحان میں شرکت کا پرائیویٹ فارم بھر کر میں پڑھائی کی غرض سے روزانہ اپنے آفس سے واپسی پر قریبی لائبریری میں جا بیٹھتا تھا۔ معصومہ بھی وہیں آیا کرتی تھی۔ میں نے اسے کبھی بھی آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ وہاں پہلے سے موجود ہوا کرتی تھی۔ اس کی ایک مخصوص میز تھی جہاں وہ مجھے روزانہ بیٹھی ہوئی ملتی تھی۔ اس

کے پاس کئی رنگوں کی قمیص تھیں مگر دوپٹے اور شلوار صرف سفید رنگ کے تھے۔ پیروں میں وہ ہمیشہ براؤن رنگ کے سینڈل پہنا کرتی تھی۔ اس کے جیسے سے یہ اندازہ لگانا مشکل امر نہ تھا کہ وہ متوسط طبقے سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ یہ اندازہ بھی لگانا آسان تھا کہ وہ ایک شریلی اور لیے دیئے رہنے والی لڑکی تھی۔ میں نے کبھی اسے کسی سے نہ ملنا فصول بات کرتے نہ دیکھا تھا۔ اس کا نام بھی میں نے ایک لڑکی کے منہ سے سنا تھا جو ایک مرتبہ اسے لینے کے لئے آئی تھی اور کچھ بات تو یہ ہے کہ میری اس کی جانب توجہ اس کے نام ہی نے مبذول کرائی تھی۔

”معمومہ!“ میں زیر لب دہرانے پر مجبور ہوا تھا۔ اور پھر اگلے روز اسے اسی مخصوص میز پر بیٹھا دیکھ کر میرے لبوں سے خود بخود نکلا ”معمومہ!“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ مجھے بہت معموم اور اپنی اپنی نگاہیں اور پھر اس کے بعد خیالات کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ خیالات کے اس سلسلے میں وہ میری ہم قدم رہی اور کچھ عرصے کے بعد ایک چاندنی سردی سے بھری رات میں میں نے اپنے گھر کے سونے کھن میں بیٹھ کر خود کو یہ یاد کرایا میں معمومہ سے محبت کرنے لگا ہوں۔

نہانے یہ محبت تھی یا میں نے اس جستجو کا نام محبت رکھ دیا تھا جو میرے دل میں اس کو دیکھ کر جاگی تھی۔ جستجو محبت نہیں ہوتی، جستجو تو جان لینے کے بعد ختم ہو جایا کرتی ہے اور محبت جان لینے کے بعد شروع ہوتی ہے۔

میں نے معمومہ کو جان لینے کی کوشش شروع کر دی۔ میں آفس سے جلد از جلد اٹھنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور بلاناہ لاہریری جایا کرتا تھا۔ میں کوشش کرتا کہ میری نشست اس کی نشست سے قریب تر ہو۔ کورس کی کتابوں کے بجائے اب میں اس کے چہرے کو پڑھنے لگا۔ میری نوٹ بک خالی رہتی اور میرے دل کے صفحات رنگین ہوتے چلے جاتے۔ ان پلکوں کا گرنا، اٹھنا، ان لہروں کا پھیلنا، سننا۔ اس کے فقرے کی بولی مجھے اذیر ہو گئی۔ میں اس کے انداز کے ہر رنگ کو پہچاننے لگا، لیکن شاید یہ محض جستجو کا سفر ہی تھا، محبت نہ تھی۔

مرد آغا میں ہی جستجو کو محبت تسلیم کر لیتا ہے اور عورت اس کی اس غلطی کو آخر تک بڑی وضع و اداری سے نبھاتی ہے۔

میرے دل میں معمومہ کو اپنانے کی خواہش جاگنے لگی۔ ہر مرد اپنی محبت کو پہلی فرصت میں اپنانا چاہتا ہے اور بے ادبات اپنی مصروفیت کو بھی فرصت میں تبدیل کر لیتا ہے۔ جو وقت مجھے اپنے امتحان کی تیاری کے لئے درکار تھا، اسے میں نے معمومہ سے محبت کرنے میں صرف کرنا شروع کر دیا اور مرد کی دلچسپی میں اتنی تپش تو ضرور ہوتی ہے کہ اسے اپنے پیاروں پر محسوس کر کے کوئی بھی لڑکی ہز ہزا کر ادھر ادھر دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہے کہ در دل پر یہ دستک کون دیتا ہے؟

معمومہ کو بھی میری نگاہ کا احساس ہو گیا۔ اب وہ قدرے الجھن کا شکار نظر آنے لگی۔ اس کے ہر انداز میں ایک کھنکھار سا آ گیا۔ بے فکری سے مختلف کتابوں کا مطالعہ کرنے کی وہ عادت رخصت ہو گئی۔ اب وہ بار بار چوتھ کر میری جانب دیکھا کرتی تھی اور مجھے دیکھتا پا کر جلدی سے اپنی کتاب پر جھک جایا کرتی تھی۔ سفید دوپٹے کے بالے میں چپکتے اس کی ستابی چہرے کی ہر ہر سطر پر بے چینی اور تذبذب کی تحریر واضح طور پر پڑھی جانے لگی۔

جب ایک روز میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے معمومہ سے سب کچھ کہہ ڈالنا چاہئے۔ یہ کہ میں اسے چاہتا ہوں۔

”معمومہ!“ میں تمہیں چاہتا ہوں۔“ ایک روز ریپرسل کے طور پر میں نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر دہرایا۔

پھر میں خود ہی سوچنے پر مجبور ہو گیا۔

اس کے جواب میں دو کیا کہے گی؟ اسے کیا کہنا چاہئے؟ اس جملے کا مفہوم کیا ہے؟

”میں تمہیں چاہتا ہوں۔“

یہ کہ میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں؟ تمہارے وجود پر تا بغض، دونا چاہتا ہوں؟ تمہاری سوجھ بوجھ پر اپنا تسلط چاہتا ہوں۔ تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

اور اگر اس نے پوچھ لیا کہ ”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟ مجھے چاہتے ہیں تو چاہتے رہیں۔ اس سلسلے میں ہمارے آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ اس سوال کا جواب بے حد آسان تھا۔ ایک سادہ سی حقیقت: ”میں تمہیں اپنانا چاہتا ہوں، معمومہ! تمہارے وجود سے اپنے وجود کی تکمیل چاہتا

ہوں۔ تمہاری خوشبو سے اپنی تنہائیوں کو جانا چاہتا ہوں۔ اپنے گھر کے سونے پن کو تمہاری پازیب کی آواز سے بھر لیتا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا ساتھ بخش دو معصومہ! مجھے شدت سے تمہاری ضرورت ہے۔“

اور اگر اس نے مجھ سے ضرورت اور محبت کے بیچ فرق جاننا چاہا پھر؟
میں سوچ میں پڑ گیا۔

ہاں! مگر کوئی تمنا پس دامن وفا
مجھ سے پوشیدہ میرے پیش نظر ہوتی ہے
”مرد کی محبت ضرورت ہی تو ہوتی ہے معصومہ!“

میری آواز کسی گہرائی سے آئی۔ ”آدم کو ازل سے حوا کی ضرورت ہے۔“
”ضرورت تو پوری ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔“ ایک استہزائیہ ہنسی میری کانوں میں
گونجی۔ ”ضرورت ہی تو تھی۔“

میرے ماتھے پہ پسینہ آ گیا۔

ہاں! اگر ایسا ہوا کہ اس نے میرا سوال یونہی ہنسی میں اڑا کر رد کر دیا پھر؟
”پھر دست سوال اس کے سامنے دراز ہی مت کرو۔“ میرے آفس کے ایک
کولیک نے حال دل سن کر مجھے مشورہ دیا۔ ”سیدھے سیدھے اس کے گھر رشتہ بھیج دو۔
لڑکیاں یوں بھی ایسے معاملات اپنے والدین کے حوالے کر دیا کرتی ہیں۔“

میں پھر پریشان پریشان سا اپنے گھر کے صحن میں آ بیٹھا۔ ایسے کام تو ماں اور بہنیں
کیا کرتی ہیں۔ میری نہ تو ماں ہے نہ کوئی ماں چاکی۔ پچھلے سال ابا کے انتقال کے بعد میں
بالکل تنہا ہی رہ گیا تھا۔ اماں تو بہت پہلے میرے بچپن میں ہی مجھے تنہا چھوڑ گئی تھیں۔

زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے شدت سے ماں کی کمی محسوس ہوئی۔ ماں کی ہستی جس کی
مہربان گود میں اپنا چہرہ چھپا کر انسان زندگی کا ہر دکہ کہہ سکتا ہے۔ جس کے کمزور وجود کے
پیچھے چھپ کر ہر طوفان کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ ماں! جو کمزوری عورت کا سب سے طاقتور
روپ ہے۔

اگر آج میری ماں زندگی ہوتی تو میں اس سے حال دل کہہ کر کتنا ہلکا ہوتا

جاتا۔ دو سب کچھ سنبھال لیتی۔ کچھ بھی کرتی، مگر معصومہ کو میرا ہٹا کر اپنے گھر لے آتی۔ میرا
کچھ شخص معصومہ کا گھونگھٹ اٹھا کر اگلیا رعبت کرنا رہ جاتا۔

ہائے! پھر وہی محبت اور پھر وہی اگلیا رعبت اس دنیا کا سب سے مشکل کام! اپنے
رد یا قبول کئے جانے کے منظر کو چشم تصور سے ملاحظہ کرنے کا کام میں نبھانے کتنے دن تک
کرتا رہا اور معصومہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا تا آنکہ میرے کولیک نے پھر مجھ سے معصومہ کی
بابت استفسار کیا۔

”تم تو بہت بزدل ہو بشر!“ وہ بولا تھا۔ ایک لڑکی سے اگلیا رعبت کرنا بھلا ایسا
بھی کیا مشکل کام ہے؟“

”مجھے کیا کرنا چاہئے؟“

”یوں کرو۔“ وہ سوچتے ہوئے بولا۔ ”اس کے لئے کوئی تھک خرید ڈالو۔۔۔۔۔ جو
عورت کے انزیکشن رکھتی ہو۔ اسے وہ تھک دو۔ وہ یقیناً وجہ جاننا چاہے گی۔ بس پھر کیا بات
ہے بات سے بات نکلتی چلی جائے گی۔ اسے تمہارے جذبات کی شدت کا اندازہ دو گا تو یقیناً
اس کے دل میں بھی تمہارے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے گا۔ عورت کے دل میں اگر ایک بار
کسی مرد کے لئے نرم گوشہ پیدا ہو جائے تو پھر اسے حاصل کرنے زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔“

میں نے باسطحلی کا شکریہ ادا کیا اور لائبریری چلا آیا۔

اب میرا زیادہ تر وقت یہ سوچنے میں صرف ہونے لگا کہ معصومہ کو کیا چیز تحفہ دی
جانی چاہئے۔ یہ میری جانب سے اس کے لئے محبت کا پہلا تحفہ ہوتا۔ ایک یادگار۔ اسے یقیناً
خاص ہونا چاہئے تھا کہ کیا؟ میری الجھن بڑھنے لگی۔

ایک روز جبکہ میں پریشانی کے عالم میں اسے نکلے جا رہا تھا اس نے جھجھکا کر اپنی
کتاب بندی اور غصیلی نگاہ مجھ پر ڈال کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

لو پھر کے لئے میرے دل کی دھڑکن ختم گئی۔ وہ نبھانے کیا کرنے جا رہی تھی؟ کیا
وہ مجھ سے باز پرس کرنے کا ارادہ رکھتی تھی؟ یا پھر لائبریری کے منتظمین کو میرے دیے کے
مستحق آگاہ کرنے جا رہی تھی؟ وہ چند لمحوں غصے اور بے بسی کے طے جلتے جذبات کے ساتھ
مجھے دیکھتی رہی، پھر اپنی کتابیں سیٹ کر مرکزی دروازے کی طرف چل دی۔

میرا دل تاسف سے بھر گیا۔ مجھے یقیناً ایسا نہیں کرتا چاہئے میرا رویہ انتہائی فضول اور احمقانہ تھا۔ کسی بھی سیدھی سادی اور شریف لڑکی کو پریشان کرنے کا یہ آسان ترین اور گنہگار ترین طریقہ تھا۔

میرے تصور کے پردے پر اس کے دو ہاتھ چپکنے لگے۔ کتابیں سینے سے ہوتے ہاتھ۔ اس کے ہاتھ بلاشبہ خوبصورت تھے۔ سفید، سفید صاف سترے، بھری بھری کٹائیوں والے ہاتھ۔

ان ہاتھوں میں رنگ بدگئی چوڑیاں سجانے کا ارمان ایک بار پھر پوری شدت سے میرے دل میں جاگ۔ میں لائبریری سے نکل کر بازار چلا گیا۔ مختلف دکانوں کی خاک چھانتا چیزیں دیکھتا پسند کرتا اور دو کرتا ہوا میں آگے ہی آگے چلا جا رہا تھا۔ جب ایک دکان کے شو کیس کے باہر ہی رک گیا۔ یہ ایک سراف کی دکان تھی اور میری توجہ شوکیس میں سے ایک جڑاؤ کنگن نے کھینچ لی تھی۔ وہ بہت خوبصورت کنگن تھیں۔ میرے تصور کے پردے پر بھری بھری کٹائیاں لہرائیں اور اس کنگن کو معصومہ کی کٹائی میں سجادینے کی خواہش سے میرا ہمارا وجود بھر گیا۔ میں دکان کے اندر گھس گیا اور اس کے مالک سے کنگن کی بابت استفسار کیا۔

”بائیس ہزار“ اس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتے ہوئے اس کی قیمت بتائی تھی۔ میں سر جھکا کر دکان سے نکل آیا۔

فٹ ہاتھ پر پھل کر اپنی بانیک کی طرف جاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں اس قابل ہوں کہ معصومہ کو بائیس ہزار کی چیز تحفہ دے سکوں؟ لیکن دل تھا کہ کسی بچے کی طرح بچل بچل کر اسی چاند کی ضد کئے جا رہا تھا۔ یہ ایک مرد کا دل تھا اور مرد شیر مار سکتا ہے۔ لیکن اپنے دل کو نہیں مار سکتا یہ کام تو ازل سے کمزور عورت کی تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے۔

میں نے ایک نگاہ اپنی بانیک پر ڈالی۔ پچھلی سینے حامد مستری میرے محلے میں رہتا تھا۔ پرانی گازیوں کی مرمت اور خرید و فروخت کا کام کرتا تھا۔ نبانے کیوں وہ پچھلے دو سالوں سے میری مونڈ سائیکل کے پیچھے لگا ہوا تھا۔

”باؤنٹی، من دسوی“ کی خیال آئے؟“ مجھے کلی میں آتے جاتے اکثر پشت پر اس کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔

اس کا خیال تھا کہ مجھے اپنی مونڈ سائیکل بیچ کر نئی مونڈ سائیکل خرید لینی چاہئے، جبکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا۔ مجھے اپنی چاند گاڑی بے حد عزیز تھی۔

حامد مستری کی ترغیب میں جیسے جیسے شدت پیدا ہوئی تھی ویسے ویسے میرے اندر ارادے کی پچھلی میں اضافہ ہوتا گیا تھا۔

میں گھر جانے کے بجائے سید حامد مستری کی دکان پر جا پہنچا۔

”مستری! مونڈ سائیکل کا کیا دو گے؟“

”بیس ہزار!“ اس نے میرے چہرے پر لکھی ضرورت پر مبنی اور فوراً کاری وار کیا۔

میں واپس مڑنے لگا تو اس نے میرا بازو تھام لیا۔

”خبر دو تو باؤنٹی! کون تو تھی دی بس.....“

پھر وہ اندر گیا اور گن کر رقم لے آیا۔

”پورے پچیس ہزار ہیں۔ ویسے کیہ کرتا اے تھی؟“ اس کے چہرے پر چمک اور لہجہ میں قلقل تھی میں جواب دئے بنا باہر نکل آیا۔ حامد مستری کی دکان سے نکل کر ایک لمبے کے لئے میں نے خود کو بے حد ادھر ادھر محسوس کیا تھا۔ جیسے اچانک کوئی حادثہ پیش آیا ہو اور کوئی بہت قیمتی شے انسان کی دسترس سے دور ہو جائے۔ لیکن پھر معصومہ کے حالات در خیال نے ہر خیال کو پس پشت دھکیل دیا۔

میں ٹیکسی کر کے جیولری دکان پر گیا اور کنگن خرید کر خوش خوش گھر چلا آیا۔

پہرہ رات میں نے کنگن سامنے رکھ کر طرح طرح کے لفظ تراشے۔ انہیں جواز

بوز کر بیٹے ترتیب دیئے اور جواہرات کے خوش رنگ خیال بننا گیا۔

اس کنگن سے بات کر کے معصومہ کا حصول آسان نظر آتا تھا۔



دوسرے روز میں آفس سے ذرا پہلے اٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ دو لائبریری نہ پہنچی ہو گی لیکن وہ مجھے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھی نظر آئی۔ اس نے مجھ پر ایک نگاہ غلط ڈالی پھر واپس اپنی کتاب کی جانب متوجہ ہو گئی۔ میں اس کی ہی نیل پر درمیان میں دو کرسیوں کا فاصلہ ٹیمپ کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک میں نے اپنے دل کی دھڑکنوں کو ترتیب دیا، پھر اسے نظر بھر کر

دیکھا وہ اپنی کتاب کی جانب متوجہ نظر آ رہی تھی لیکن یقیناً میری موجودگی کو بھرپور طریقے سے محسوس کر رہی تھی۔

میں نے ڈیٹا نکال کر میز پر رکھی اور کچھ سوچنے لگا۔ میں ہملا کس طرح اسے متوجہ کرتا؟ مجھے کیا کہنا چاہئے تھا؟ میں اسے لائبریری سے باہر نکلنے کا کہنا چاہتا تھا لیکن الفاظ کا چناؤ مجھے مشکل محسوس ہونے لگا۔

میں نے ایک عجیب سی حرکت کی۔ میں نے ننگن کو ڈبیہ سے نکالا۔ میز پر کھڑا کیا آہستہ سے لڑکا دیا۔ وہ بھی ایسے معاملات میں بڑا پکا نظر آتا تھا۔ ستانہ دار میں اس کی نگاہوں کے سامنے جا کر گر گیا۔

معصومہ نے از حد حیرانی سے پہلے ننگن کو پھر مجھے دیکھا تھا۔ میں نے ڈبیہ بھی میز پر چھوڑی اور اٹھ کر لائبریری سے باہر چلا آیا۔ باہر آ کر میں لان میں جا کھڑا ہوا۔ وہ بھی میرے پیچھے آئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ننگن تھا۔

"سنیے!" میں جھینپا جھینپا سا تھا۔

"جی نہیں۔ میں نے محض اسے خریدا ہے۔ یہ آپ کے لئے بنا ہے۔" مجھے اس

کے لہجے کی نری سے حوصلہ ہوا۔

"میں کبھی نہیں۔" اس کی آنکھوں میں اول روز الجھن اور حیرت تھی۔

"یہ میری جانب سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہے معصومہ!"

"لیکن کیوں؟"

"اس لئے کہ میں... میں... میں..."

وہ واحد لمحہ جہاں مرد کی زبان عورت کے سامنے لڑکھڑاتی ہے میرے مقابل

کھڑا تھا۔

"جی کیسے!" وہ نظریں جھکائے کھڑی تھی۔ اور اگر اس لمحے میں عورت خود ہی

ہتھیار ڈال کر کھڑی ہو جائے تو پھر فتح یاب ہونے میں کیا امر مانع ہو سکتا ہے۔

معصومہ نے میرا ننگن قبول کر لیا لیکن اس شرط کے ساتھ مجھے واپس لوٹا دیا کہ وہ

ننگن میں اسے شادی کے موقع پر پیش کروں۔

میں اس کو بیت چکا تھا پھر ہملا شادی میں کیسے تاخیر ہوئی۔ جلد ہی وہ میری دلہن بن کر میرے گھر کے اسی چھوٹے سے صحن میں اتر آئی جہاں بیٹھ کر میں اس کے تصور سے تھکنوں کو نشتو کیا کرتا تھا۔

شادی کے لئے میں نے اپنے آفس سے لون لے لیا تھا۔

ہماری زندگی خوشگوار انداز میں آگے بڑھنے لگی۔ بیٹی کی پیدائش کا موقع آیا تو میں

نے آفس سے مزید لون لیا۔ میری تنخواہ تقریباً آدھی لون میں کٹنے لگی۔

معصومہ کو گھر کے کاموں سے فرصت نہ ملتی تھی۔ میں آفس میں اور در نام لگا رہا تھا۔

اب مجھے لون اتارنے کی لینٹن رہتی تھی۔ گھر لوٹنے کی جلدی نہ ہوا کرتی تھی۔ گھر آ کر بھی

میں جلد سے جلد سو جانے کی فکر میں رہتا تھا۔

معصومہ کی گفتگو میں اب وہ پہلے کی سی چاشنی نہ تھی۔ اسے گھر کے مسائل از بر

رہتے تھے وہ محبوبہ سے خاتون خانہ اور بیوی سے ماں بن گئی تھی۔ میرا ذہن مختلف خانوں میں

بار بٹاتا تھا۔

سب سے زیادہ پریشان کن مسئلہ کنوئیں کا تھا۔ میں سر توڑ کوششوں کے باوجود

اب تک دوبارہ موٹر سائیکل نہ خریدا تھا۔ بسوں اور دیکھوں میں دھکے کھا کھا کر سال بھر

میں میرا جوڑ جوڑ مل گیا تھا۔ رشتے داریاں جابہی پڑتیں تو رکشوں اور لکھیوں کا کرایہ مار

ڈالتا۔ معصومہ کو میری مشکل کا احساس تھا۔ وہ بے چاری میری مشکل آسان کرنے کے لئے

کینٹیاں ڈالتی لیکن وہ گھر کے کسی دوسرے مسئلے کا حل بنا جایا کرتی تھیں۔

ایک روز میں آفس جانے کے لئے جھپک تیار ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ کھڑی کی

سوئیں کو کوکھوں سے ہٹا دیا۔ جو ہا کسی کی مشکل کا احساس کئے برق رفتاری سے آگے بڑھتی ہی

رہتی ہیں۔

اچانک ہی معصومہ میری قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

"سنیے!" اس کے چہرے پر عجیب سی کیفیت تھی۔

"کہو!" مجھے ہلکت تھی۔

"آج آپ آفس مت جائیں۔"

”کیوں؟“ میں مدہم ہو گیا۔ ”رواغ ٹھیک ہے؟“
 ”آج آپ جا کر اپنے لئے موٹر سائیکل خرید لیں۔“ اس نے ایک لفافہ میری
 جانب بڑھایا۔

”اس میں تیس ہزار روپے ہیں۔“

میرے ہاتھ یک لخت ٹھہر گئے۔ بجٹ کے تمام انداز رخصت ہوئے۔
 ”تمہارے پاس اتنی رقم کہاں سے آئی معصومہ؟“ میں حیرت اور خوشی کی ملی جلی
 کیفیات میں گھرا ہوا تھا۔

”اگر میں سچ کہوں تو آپ خفا تو نہ ہوں گے.....“ وہ گھبرائی گھبرائی سی تھی۔
 ”کہو تو؟“

”میں..... اپنا کچھ زور فروخت کر آئی ہوں۔ بشر اچھے سے آپ کی پریشانی دیکھی
 نہیں جاتی۔ میں نے اماں کی طرف والی چیمن اور دو..... کنگن..... جو آپ نے شادی سے قبل
 خریدا تھا۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس بحرِ غمامت میں میرا دل بھی لمحہ
 بھر کو ڈوبا پھر میں نے جلدی سے اس کے ہاتھ سے لفافہ لے لیا۔

”تم کتنی اچھی ہو معصومہ! تمہیں میرا کتنا خیال ہے۔ مجھے احساس ہو رہا ہے میرا
 انتخاب کس قدر درست تھا۔ میں وعدہ کرتا ہوں بہت جلد تمہیں دوسرا کنگن بخوادوں گا۔“
 ”مجھے زور نہیں..... ذہنی سکون چاہئے اپنا اور آپ کا!“

میں نے اس کا گال تھپتھپایا اور لفافہ جیب میں ڈال لیا۔ میری نگاہ اس کی غالی
 کلائی پر پڑی تو میں سر جھکا کر گھر سے نکل گیا۔

میرے دل میں فی الوقت ایک موٹر سائیکل کی شدید خواہش تھی اور جیسا کہ میں
 کہہ چکا ہوں دل مارنا خدا نے صرف موت کو سکھایا ہے۔

”معصومہ نے میری جستجو بھی پوری کر دی تھی اور ضرورت بھی۔ مرد آغاز میں ہی جستجو
 کو محبت تسلیم کر لیتا ہے اور عورت اس کی اس غلطی کو آخر تک بڑی وضع داری سے نبھاتی ہے۔
 یہی میری اور معصومہ کی کہانی ہے!“

خواہشوں کی تتلیاں

رات کا چھپا پہر تھا بائیں کی جانب کھٹنے والی کمڑکی میں چاند بالکل درمیان
 میں آ رہا تھا۔ یوں جیسے وہ ہاتھ بڑھاتی تو اس کی تتلی پر آ نکلتا۔ اسے چاند تاروں کی خواہش
 نہ تھی۔ روپیہ پیسہ ہاتھ کا میل تھا۔ زبیر کپڑوں سے جی یوں بھرا تھا کہ الماریاں نت نئی
 چیزوں سے بھری پڑی تھیں۔ اور دو بیواؤں کا روپ دھارے بھرا کرتی۔ دیوانوں کی سی
 باتیں کیا کرتی۔ گھر سے پھرنے کے سارے شوق کب کے ہوا ہو چکے تھے۔ بھری خوبصورت
 دنیا اس کے لئے جیسے راستے میں پڑنے والا بازار بن گئی تھی۔ ایسا بازار جس کی دکانیں اور
 ان میں بیچیے اشیاء آنکھ کی تکی کا نقش بن چکی ہوں۔ جن کی جانب دیکھنے کو اب من نہ کرتا: وہ
 جہاں سے کچھ خریدنے کی حاجت محسوس نہ ہوتی: وہ کوئی شے دل لہجائی نہ ہو۔ جہاں سے
 چند از جلد گزر جانے کی خواہش ہو۔ دنیا اس کے لئے ایسا ہی بازار تھی۔

رات کی رانی کی مہک سے لبریز ہوا کا جھونکا کرے میں آگھسا۔

اس کے لیوں سے سسکی نکلی گئی۔ کبھی یہ ہوا کتنی روت پرور لگا کرتی تھی۔ کبھی یہ مہک
 تن میں کو جذبوں سے مہکا دیا کرتی تھی۔ کبھی پورے چاند کا منظر کیسا سرور عطا کرتا تھا اور آق
 براہمی خوبصورت بات دیکھے دل کو مزید دھکی کیا کرتی تھی۔ آق درد کا کچھ در مان نہ تھا۔ پورا
 چاند مسمی ہوا ساتھ لینا سن چاہا جیون۔ مسمی کچھ بھی اس کے دل کو خوشی نہ بخشا تھا۔ درد
 نہ مٹانے کو ایک چھینٹا فخر دی کاٹی ہوتا تھا۔ صبح ہی تو اماں کہہ رہی تھیں۔

”یہ ہوا آگ کو درخت تو بالکل ہی کام سے گیا۔ لوگوں کے درختوں سے بھر بھر پور آیا
 ہے اور اس کو دیکھو کیسا بچا کھڑا ہے۔ اب کی بار اس کو کٹواؤں دوں دوسرا پودا لگواؤں گی۔“

اور بھابی نے اسے سیر میوں کے پاس کھڑا دیکھ کر مسکرا کر کہا تھا۔

”اماں! کہیں آپ کی بھیلی بھوکا سا یہ تو نہیں پڑ گیا اس پر بھی؟“

آہ..... ایک جملہ ہی تھا چند الفاظ ہی تھے مگر کیسی قیامت پھا ہوئی تھی اس کے دل و دماغ میں کہ آنسو پوری رات بہتے ہی رہے۔ سسکیاں سینے میں گھنٹی رہیں ہچکیاں گلے میں اکٹتی رہیں۔

ہر چند کہ اماں نے اپنی بات پہلے کہی تھی اور فخرہ بھابی نے بعد میں مگر اسے نبھانے کیوں وہم سا پڑ گیا تھا۔ کہ بھابی نے جملہ پہلے ادا کیا تھا اور اماں نے وہ دمکی بعد میں دی تھی۔

”اب کی بار اسے کتنا ہی دوں دوسرا پروا لکھواؤں گی۔“

نبھانے اماں کا کیا مطلب تھا۔ نبھانے وہ آم کے درخت کی ہی بات کر رہی تھیں یا پھر..... یا پھر..... اس کا سر پھرانے لگا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”ارے مرد کو اللہ نے چار کی اجازت دی ہے تو کوئی مصلحت ہی ہو گی نا۔“ اماں اکثر اسے اس پاس دیکھ کر کہا کرتی تھیں۔

”بے چارہ اشعر!“ فخرہ بھابی سناتیں۔ ”مرد اپنے بچے کو گود میں لے تو ذرا اس کا چہرہ دیکھا کر ڈبکھی دیکھی ہے وہ روشنی اشعر کے چہرے پر؟“

”ان کے ساتھ نبھانے کیا پرالم ہے؟“ شہ پارہ کہتی۔ ”ہم تو قسم سے منصوبہ بندی بھی کریں تو وہ بھی ناکام ہو جاتی ہے۔“

اس کے ساتھ کیا پرالم تھی وہ ابھی طرح جانتی تھی۔ آج سے چند سال قبل وہ اور اشعر اپنا مکمل میڈیکل چیک اپ کروا چکے تھے۔

اشعر ہر لحاظ سے صحت مند لڑکا باپ بننے کے لائق تھا لیکن اس کے اندر مادہ اعضاء کی نمو پوری طرح نہ ہو پائی تھی۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔

اس خبر نے اس کی ہستی کے ہر تار کو ہنچھوڑ کر رکھ دیا تھا اور وہ گونج اب تک اس کے خون میں رواں تھی۔

وہ کمرہ وہ میز وہ میز کے پیچھے بیٹھی وہ ڈاکٹر اس کے گلے میں ٹکاتا اسے تھسکوپ اور

اس کا اس لئے ادا کیا گیا جملہ..... ایک ایک شے اس کے حافضے پر نقش تھی۔

”آئی ایم ساری ٹو سے دیٹ..... مگر حقیقت یہی ہے سزا اشعر..... آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔“

”آپ کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔“

اس کے لبوں سے ایک کراہٹ نکلی۔ ڈر کر اس نے اشعر کی جانب دیکھا وہ اسی لئے جاگ گیا تھا۔ تانیہ نے جلدی سے آنکھیں پٹی کر کرٹ بدل لی۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ اشعر کی نیند خراب ہو اس سے زیادہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اشعر کا دل خراب ہو اسے روتا پا کر وہ ڈسٹرب ہو جاتا تھا۔

”تانیہ!“ اشعر کا ہاتھ اس کے کان سے پر آ رکا۔ اس کی ہتھیلی میں نیند کی حدت تھی۔ وہ محبت بھری پیش اس کے سر وہ جود کو سکون بخشنے لگی۔ آنسو پوری روانی کے ساتھ اس کی گردن پر لکیر بنانے لگے۔

اشعر نے اس کا رخ اپنی جانب کیا۔

”اوہ..... مائی گاڈ!“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ”تانیہ..... میری زندگی! کب سے رورہی ہو۔“ سارے اختیار رکھ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

اشعر نے اسے اٹھا کر اس کا سر شانے سے لگا لیا اور اس کی پیٹھ تھپکنے لگا۔

”بس یار۔ بس کرو..... پلیز.....“

وہ اٹھا اور دم فرنج سے ٹھنڈا پانی لے کر آیا۔

”خود بھی مر جاؤ گی اور مجھے بھی مار ڈالو گی تم..... کیوں اتنی ظالم ہو..... کیوں خود پر اتنا ظلم کرتی ہو چار بج رہے ہیں صبح ہونے والی ہے اور تم رورہ کر خود کو مٹانے میں لگی ہو۔“

”میں مٹ جانا چاہتی ہوں اشعر۔“ وہ زخمی لہجے میں بولی تھی۔ ”میرے ہونے سے کتنوں کا سکھ چین خطرے میں ہے۔“

”ان سب میں کہیں تم نے میرا نام تو شامل نہیں کیا؟“ وہ شرارت سے پوچھنے لگا۔

”اب یہ مت کہہ دینا کہ تم تو ناپ آف دی لسٹ ہو۔ رات کے آخری پہر تم

یونہی نکلنے لگی ہو۔ یاد ہے جب اپنی شادی ہوئی تھی۔۔۔۔۔

”اشعر پلیز۔۔۔۔۔“ اس نے سوچی سوچی آنکھوں سے التجا کی۔ ”میرا دل اب ان کھلونوں سے نہیں بہکتا۔ بھول جاؤ ان سب باتوں کو مجھے مجھ سے وابستہ ہر شے کو۔۔۔۔۔ بھول جاؤ اشعر۔۔۔۔۔“

وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

”میں پھر کبھی ہوں اشعر۔۔۔۔۔“ باقی بات کہنے کی اس کی ہمت نہ ہوئی۔ اس نے دانتوں سے ٹپکالبا دبا لیا۔ وہ جب بھی یہ بات کہتی تھی اس کا رد عمل بڑا شدید ہوا کرتا تھا۔ ”بولو۔۔۔۔۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔“ وہ چپتے ہوئے لہجے میں پوچھنے لگا۔

تانیہ نے سر جھکا لیا۔

”بولو تانی! کہہ دو جو تمہارے دل میں ہے پھر میں جانوں اور میرا دل۔“ وہ لب کاٹتا اسے ہمیشہ بہت اچھا لگتا تھا اور یہ بات اس نے کبھی اشعر کو نہیں بتائی تھی۔

”اشعر!“ وہ اسے محبت سے دیکھ کر بولی۔

”بولو۔“ اس نے ایک ناراض نظر اس پر ڈالی۔

”اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہیں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی تھی۔

”مجھے صرف وہ راستہ پسند ہے جس پر تم میرے ساتھ ہو اور میں اسی راستے پر چل

رہا ہوں۔“

”یہ راستہ۔۔۔۔۔ پتھروں سے، کانٹوں سے، طعنوں سے، تشوؤں سے انا پڑا ہے

اشعر!“ وہ سسکی۔ ”اور میں نیچے پاؤں اس پر خاد سے پر نجانے کب سے چل رہی ہوں۔

میری روح تک زخمی ہو چکی ہے۔“

”جسمیں اپنے ساتھی پر بھروسہ نہیں ہے۔ تانیہ!“ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر پوچھنے لگا۔ ”تم مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا کرتی ہو تمہیں میری خوشی عزیز نہیں ہے۔

ذرا سی باتوں سے گھبرا کر مجھ سے جدا ہونے کی بات سوچ لیتی ہو۔ اچھی محبت ہے

تمہاری۔“

”مجھے تمہاری خوشی ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔ اشعر!“ اس نے اشعر کا ہاتھ

تھام لیا۔ ”اور میں تمہاری خوشی کے لئے ہی کہتی ہوں۔۔۔۔۔ دوسری شادی کر لو۔“

اشعر نے ہاتھ چھڑوا لیے۔

”بس کرو سو جاؤ۔“

”اشعر۔۔۔۔۔ میں میں یہیں رہوں گی تمہارے پاس تمہارے بچے اپنے بچوں

کی طرح پالوں گی ان سے اپنی جان سے زیادہ پیار کروں گی۔ ان کی ماں کو اپنی محبت سے

بیت لوں گی۔ اسے بہنوں کی طرح چاہوں گی۔ اشعر۔۔۔۔۔“

”میں نے کہا تھا تارا رات کے آخری پہر تم بہک جاتی ہو۔“ وہ اپنی جگہ پر لیٹے

ہوئے بولا۔ ”مجھے صبح آفس جانا ہے میں تمہاری اول فول مزید نہیں سن سکتا۔“

”اشعر! میری بات تو سنو۔“

”کیک کو امن تانیہ!“

اس نے ہاتھ بڑا کر بتائی بچھا دی۔



وہ اشعر کی خالہ زاد سوتیلی۔ خدا نے جیسے ان دونوں کو ایک دوسرے کے لئے ہی بنایا

تھا۔ اس نے میٹرک کیا تھا جب میں رزلٹ والے دن نمیزہ خالہ اس کے لئے چار جوتے

اور ایک خوبصورت انگوٹھی لے کر آئینی تھی۔

تانیہ کے والدین تو شروع ہی سے اس رشتے کے حق میں تھے۔ اشاروں، کنایوں

میں کئی مرتبہ یہ بات ہو چکی تھی پھر اشعر کی بولتی نگاہوں سے کتنی ہی مرتبہ خوشبو جیسے پیام بھیجے

تھے۔ تانیہ اس کے حال دل سے واقف بھی تھی اور خود شریک حال بھی۔

خالہ کی پہنائی ہوئی انگوٹھی اشعر کے دل کی طرح چار سال اس کے وجود سے لپٹی

رہی۔ چار سال بعد وہ اپنا وجود اس کے نام لکھ کر اس کے من آگن میں خوشبو کی طرح

آہٹی۔

اشعر اپنے والدین کا سب سے اہل حق سب سے خیر و اور چھوٹا بیٹا تھا۔ ہر چند کہ

اس سے بڑا بھائی اور بھی تھا اور چھوٹا بھائی لیکن جو محبت اشعر کے حصے میں آئی تھی وہ کسی

اور کی قسمت میں کبھی نہ بنی۔ یہی محبت تانیہ نے بیوہ بن کر سمیٹی۔ اس سے پہلے ناخروہ بھائی

اس کمر میں موجود تھیں۔ دو بیٹوں کی ماں ہونے کا تہذیبیہ وقت ان کے سینے پر جوار بتا تھا۔ پیشانی پر بڑی بہو اور بڑے خاندان کی بیٹی ہونے کا فخر چمکتا تھا۔ پھر بھی جو استقبال کمر میں تانیہ کا ہوا اس سے ان کے غرور کا چراغ مدہم پڑ گیا۔

تانیہ کا جو ہر خاص اس کی خوش خلقی تھی۔ اس کی آواز میں کوئل کی سی سناس اور سر تھا پھر وہ بولتی بھی بڑے دلکش انداز میں تھی۔ نرم و ملائم لہجے میں وہ جب دل موہ لینے والے الفاظ میں گفتگو کرتی تو چھوٹے بڑے اس کے گردیدہ ہو جاتے تھے۔

پھر حسن میں وہ اپنی مثال آپ تھی۔ کمر سے نیچے آتے سیاہ ریشی بال اس کا خزانہ تھے۔ وہ ان کی جی جان سے حفاظت کرتی۔ بھنورے کی سی آنکھیں اور سنہری دکتی رنگت۔ خدا نے اسے کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔

اشعر تو پہلے ہی اس کا دیوانہ تھا۔ اس کے مل جانے کے بعد تو وہ خود کو بھی بھول گیا۔ خالہ کی جیتی بھائی تھی پھر بڑی بہو سے اتنے سالوں میں کئی اختلافات ہوئے تھے۔ انہوں نے جان بوجھ کر بھی تانیہ کا پر زور استقبال کیا تھا۔

ناخروہ بھابی نے پہلے دن سے ہی اس کے لئے جذبہ رفاقت محسوس کیا تھا اور چند سالوں میں تو وہ اس کی روایتی حریف بن گئی تھیں چنانچہ اصرار کے لئے انہوں نے اپنے خاندان کی لڑکی جتنی اور اپنی کزن شہ پارہ کو بیاہ کر لے آئیں۔

تانیہ کو خاندانی سیاست سے مطلب نہ تھا۔ وہ اشعر کی محبت کو مضبوط اور جادواں حصار میں خود کو ہر طرح سے محفوظ خیال کرتی تھیں۔ ساس سرور اور نند اس کے دیوانے تھے۔ اس کے قصیدے ہر جگہ پڑھا کرتے اس کی راجدھانی کو کسی حریف سے خطرہ نہ تھا۔

وہ خود میں کمن بے پروا خوش خوش رہا کرتی۔ تب ایک دن زندگی کی حسین پر سکون جھیل میں خوشی کے ان گنت کنول کے پھولوں کے درمیان اضطراب اور بے یقینی کا پہلا پتھر روایتی حریف کی جانب سے آیا تھا۔

”اماں!“ اس مہینے کی بارہ کو تانیہ اور اشعر کی شادی کی تیسری سالگرہ ہے۔ ہے۔“ مٹر کے دانے نکالتی ناخروہ بھابی قدرے ہلکے پھلکے انداز میں بولی تھی۔

”ہاں۔“ اماں نے حساب لگاتے ہوئے کہا تھا۔

”یہ لوگ۔۔۔ کہیں۔۔۔ اب تک۔۔۔ میرا مطلب ہے شہ پارہ کی پریکٹسی کا تیسرا مہینہ چل رہا ہے۔ اس کے بیاہ کو کل پانچ ماہ ہوئے ہیں یہ لوگ شاید اس الجھن میں پڑنا نہیں چاہتے۔“

اماں نے لہجہ بھر کو سوچا تھا۔ قدرے فاصلے پر گھد ان کے پھول بدلتی تانیہ کے ہاتھ ست پڑ گئے تھے۔

”ہوتا ہے بھو ایسا بھی۔“ پھر اماں بے فکری سے بول پڑیں۔ ”کون سی عمریں گزر گئی ہیں۔ پورے بیس کی بھی نہیں تھی تانیہ شادی کے وقت، بعض لڑکیاں زیادہ وقت لیتی ہیں۔“

ناخروہ بھابی بد مزہ سی ہو کر خاموش ہو گئی تھیں لیکن تانیہ کے دل میں پہلی پھانس جھپٹی تھی۔ اسے بڑا اور دمخوس ہوا۔ رات کو بیڈ روم کی تنہائی میں اس نے اشعر سے پہلی بات یہ بتا گئی۔

”اوہ۔۔۔“ وہ ہنس ہنس کر دوہرا ہو گیا۔ ”ارے بھئی میری چھوٹی سی ننھی منی بڑی تو چپکے سے بڑی ہو گئی اور مجھے خبر بھی نہ ہوئی۔ ماں بننے کا شوق جو آیا ہے ہاں؟“

”اشعر۔۔۔ پلیز۔۔۔“ اسے اشعر کا بننا اہمانہ لگا۔ وہ سسکے پر سنجیدگی سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ سسکے میں بھی ای اور بھابی کئی مرتبہ دبے لفظوں میں یہ ذکر کر چکے تھے۔

”کیا آپ کو بچے پسند نہیں؟“

اشعر جواب دینے کے بجائے اسے شریر نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ جھینپ کر گلہائی ہو گئی۔

”اشعر۔۔۔ پلیز۔۔۔“ جھکی جھکی نظروں سے اس نے استہجاک۔

”بچے تو بھئی مجھے بہت پسند ہیں۔“ دو اطمینان سے بولا۔ ”میرے بھتیجوں سے پانچونہ گھر میں سب سے زیادہ انہیں میں پیار کرتا ہوں۔“

”تو پھر ساری عمر بھتیجوں سے پیار کرتے رہیں گے؟“ اس نے محبت بھرا شکوہ کیا۔

”نہیں جی۔۔۔ عمر بھر پیار کرنے کا وعدہ تو آپ سے ہے۔“ وہ ہنوز اسی مودت میں تھا۔

تانیہ نے تکیہ اٹھا کر اس کے سر پر دست مارا۔ وہ ہنسنے لگا۔ تانیہ کو بھی ہنسی آگئی۔
بات آئی گئی ہو گئی تھی۔

لیکن بات اس وقت ان کے درمیان ہی آئی گئی ہوئی تھی۔ شہ پارہ کے ہاں
نصفی گلابی سی گڑیا کی آمد ہوئی تو عزیز رشتہ دار ہمسائے دوست احباب سب ہی کے منہ مکمل
کئے۔ جو بھی آتا وہ تانیہ پر ایک آدھ فقرہ چست کرنا اپنا فرض خیال کرتا۔ ہر طرف سے
تیروں کی بوچھاڑ ہوئی تو وہ پور پور چھل گئی۔

"اشعر..... مجھے لیزڈی ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔ مجھے اپنا چیک اپ کروانا ہے۔"
اس کی ایک ہی منہ تھی اور اشعر کو نبھانے کیا وہم تھا وہ اسے بھلاتا رہتا۔

"چلیں گے یار!" کون سی ہماری عمریں دخل گئی ہیں اور پھر جن کے ہاں
اولاد دیر سے ہوا ان میں بڑی انڈر اسٹینڈنگ اور محبت ہوتی ہے۔

"وہ کیسے؟" وہ چڑ جاتی۔

"شادی کے فوراً بعد ہی جو عورتیں حاملہ ہو جائیں وہ شوہر کو مکمل محبت اور توجہ نہیں
دے پاتیں۔ ان کا دھیان بٹ جاتا ہے۔ ہر چیز میں احتیاط شامل ہو جاتی ہے۔ کھوسنے
پھرنے کا بچے سنورنے کا شوق مائل پڑ جاتا ہے شوہر الگ بد مزہ ہوتا ہے پھر جب نووارد
وارد ہو جاتے ہیں تو پھر تو سمجھو شوہر بے چارے کا کام تمام۔ آفس سے تھکا ہارا آئے تو بیگم
بچہ تھما کر کچن میں غائب ہو جاتی ہے وہاں سے نکلتی ہے تو بچہ لے کر پھر کسی کمرے میں غائب
ہو جاتی ہے۔ یہ بے چارے حیران پریشان فی دی آن کر لیتے ہیں۔ سچ پتا چلتا ہے فی دی
دیکھتے دیکھتے کسی لمحے آنکھ لگ گئی تھی۔ بیگم نے چپکے سے فی دی بند کر کے سناٹے میں ڈال دیا
تھا۔"

تانیہ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا تھا۔ اشعر کی اوٹ پانچ باتوں اور مسکندہ خیر
تاثرات نے اسے تقریباً بھلا ہی دیا تھا کہ وہ کیا بات کر رہی تھی۔

پھر ہوا یوں جو دن پر لگا کر بے فکری سے اڑ جایا کرتے تھے ان کے پردوں میں
اب پہلی سی تیزی اور تازگی نہ رہی۔ بے نشینی اور اضطراب کے جہاگ اڑاتے چیتوں نے
دنوں کے پر بوجھل کر دیئے۔ شہ پارہ تین ماہ بعد پھر حاملہ ہو گئی۔ اس کی بیٹی بہت چھوٹی تھی

لیکن وہ بہت خوشی اور مطمئن تھی۔

"اگر کو بیٹا چاہئے۔ دیر کس بات کی؟ اچھا ہے ساتھ ساتھ چل جائیں گے۔"
وہ بیٹے کے لئے دغائے پڑھتی رہتی۔ تانیہ کو اماں نے اولاد کی نعمت سے سرفرازی
کے دغائے دیئے تو اسے خوفِ ماحسوس ہوا۔ زندگی میں ایک بڑے خلا کا احساس ہوا سب
تہجہ ہوتے ہوئے تہجہ بھی نہ ہونے کا احساس۔

وہ دغائے پڑھنے لگی۔ آس کی جوت بار بار چلتی اور بار بار بجھ جاتی۔ جس قدر
خشوع و خضوع سے وہ پڑھا کرتی اتنی ہی گھٹا نوپ مایوسی اسی گھیرتی چلی گئی۔

شہ پارہ نے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا تو وہ نیکیے میں منہ چھپا کر خوب روئی۔ اشعر
ساری رات اسے دلا سے دیتا رہا۔ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھاتا رہا لیکن آنسو تھمنے کا دم نہ
لیتے تھے اور خند تھی کہ چکوں کی دہلیز چھوٹے کو تیار نہ تھی۔

"میں نے بھی تو دھپ پڑھے تھے اشعر! میں نے بھی تو دعائیں مانگی تھیں۔
نہانے اس کی دعا قبول کی میری سارا دلونا دی۔"

"تانیہ! خدا کسی کی دعا نہیں لوٹاتا۔ ہر بندے کی دعا قبول کی جاتی ہے خواہ
قبولیت کا انعام روز قیامت ہی کیوں نہ ملے۔ دیکھو تانیہ! دنیا میں بے شمار بے اولاد جوڑے
ہیں یہ آزمائش اللہ نے بہتوں کی رکھی ہے۔ لیکن یہ سوچو کہ اس آزمائش کا انعام بھی تو ہو گا
اور اللہ کا انعام ہر نعمت سے بلند اور بھاری ہے۔ ہم اس انعام کا کیوں نہ سوچیں۔

"نہیں اشعر! نہیں اللہ کا واسطہ یوں نہ کہو۔ یوں کہو کہ انشاء اللہ! اللہ ہمیں بھی
اولاد دے گا۔ ہمیں بھی آزمائش میں نہیں ڈالے گا! ہمیں اپنی ہر نعمت سے نوازے گا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو مگر انسان کو بلند حوصلہ ہونا چاہئے اور دوسروں سے مسابقت
فی روز بہت تھکا دینے والی ہوتی ہے۔ اولاد ہو جائے تو بیٹوں کی دوز بٹنے ہو جائیں تو ان
کے مستقبل کی دوز۔ ہر وقت انسان اپنے انصیب سے حالت جنگ میں رہتا ہے تانیہ! اولاد
دینا نہ دینا اللہ کا کام ہے۔ اس کی اطاعت اس کے فیصلوں پر سر تسلیم خم کرنا انسان کی ذمہ
داری ہے۔ یوں دل کو چھوٹا نہ کر دو۔"

اشعر نے اس کو سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کر لی لیکن فی ثرہ بجا بھی اور شہ پارہ کے

بنتے مسکراتے چہرے اس کے ذہن سے نہ نکلتے تھے۔



اور پھر اس نے اشعر کو میڈیکل چیک اپ کے لئے آمادہ کر بیٹھا۔

اور پھر ڈاکٹر نے اسے زندگی کی سب سے تلخ حقیقت بتائی تھی۔ جس نے اسے جینے کی خواہش سے ہی محروم کر دیا۔ کتنے دن کتنی راتیں وہ کمرے میں بند سب کی چھٹی سوال کرتی نظروں سے دور نیچے میں منہ چھپائے پڑی رہی۔

اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ ناخروہ بھابھی کی طنزیہ نگاہوں اور مسخرانہ مسکراہٹ کا سامنا کرتی۔ شہ پارہ کی غرور سے بھری چال اور فخریہ جملوں سے اسے تباہی میں بھی خوف محسوس ہوتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سکی خالہ کا بھجا، دا چہرہ اور بیگی پکوں کا خیال اسے اندر سے کانٹے لگتا۔

وہ بیمار پڑ گئی۔ تنہا کی جلتی لو کیا جھنجھٹی تھی کہ وہ راکھ بن کر رہ گئی۔ رنگ جلس کیا آنکھوں کے گرد سیاہ حلقوں نے ذریعہ ڈال لیا۔ بال نوٹے کرتے شاٹوں تک آ پٹپٹے۔ وہ آپ اپنا مذاق بن گئی۔ ایسے میں اشعر اس کے دکھی دل کا مرہم تھا۔ وہ اس کا ہم روز، ہم نفس، قدم قدم پر اس کا ہاتھ تھا۔

"تانیہ! اللہ نے ہر انسان کو مکمل بنایا ہے۔ مجھے 'جھبیں' ہم سب کو۔ کسی کا ہاتھ نہیں ہے، وہ بھی مکمل ہے۔ کسی کی ٹانگ نہیں ہے، وہ بھی مکمل ہے اس جسم ساز نے جب مٹی کے بے جان پتے میں روح پھونکی تو سمجھو کہ اسے جسے مکمل ہو جانے کا یقین تھا۔ وہ جسم کو نامکمل جانتا تو اس میں روح کیوں پھونکتا؟ اب مٹی کے اس مجھے کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کو پہنچ کرے اور اسے بتائے کہ اس نے؟ تمام جسم بنایا ہے۔ اس کی معجزات وہی جانتا ہے۔ جن کے پاس اولاد ہے، وہ اس اولاد کے پیدا کرنے میں با اختیار نہ تھا۔ انہیں خدا کے فرمانے سے وہی ملا جو اس نے دینا چاہا۔ اب اگر وہ جھوٹا فخر و غرور جتا کہیں تو ان کا فخر و غرور انہی کے لئے جھوڑا، خود پر خاری مت کر دے۔ تانیہ! تم اپنے آپ میں تلاش کرو کہ اللہ نے ان کی اس برتری کے جواب میں جھبیں کن کن چیزوں سے فوقیت دی ہے۔ یقیناً جھبیں بہت کچھ نظر آئے گا اور پھر تم اپنے رب کا شکر ادا کرو گی۔"

اس نے اشعر کی باتوں پر توجہ دینا شروع کی تو طبیعت میں بہتری آنے لگی۔ شادی سے پہلے اس نے پرائیویٹ بی اے کیا تھا۔ اب ریگولر ایم اے میں داخلہ لے لیا۔ صبح سویرے جب وہ گھر سے اشعر کے ساتھ نکلتی تو ناخروہ بھابھی اور شہ پارہ کی دہنی دہنی مسکرائیں اس کا پیچھا کرتیں۔ وہ یوں ظاہر کرتی جیسے اس نے کسی کو دیکھا ہی نہ ہو۔ کبھی ان کا کسا، دا فقرہ کان میں پڑ جاتا۔

"ہائے... بے فکری کی زندگی! بیچ نہ ہوں تو عورت خود ہی بچہ بن جاتی ہے۔"

"دہنی دہنی ہنسی تعاقب کرتی۔ اس کے کانوں میں سیسہ پڑتا۔ دل سے نہیں اٹھتی۔"

کبھی سانس کی آہ بھری سانس پیچھا کرتی۔

"میرا اشعر....." وہ اکثر کہا کرتیں۔ "کیا خبر تھی....."

تانیہ سب کچھ سن کر بہری ہو جاتی۔ گونگی تو وہ ایک مدت ہوئی بن چکی تھی۔ یونینڈرشی جا کر بھی جین نہ ملتا تھا۔ لڑکیاں لڑکے باتوں باتوں میں ٹہنی زندگی کے متعلق سوالات کرتے پھر وہ کاسن روم میں ترس اور ہمدردی بھرے الفاظ سنیتی رہتی۔

ہاں نہ بن سکتا کیا اتنا بڑا جرم ہے؟ اس روئے زمین پر عورت پر کتنے والا سب سے بڑا الزام بانٹھے ہیں! کیوں؟ اس میں عورت کی خطا کیا؟ یہ تو اس خالق کا کام ہے جو عورت کو جنس ایک ذریعہ بناتا ہے۔ اگر اس کام کے لئے اللہ نے اسے نہیں چنا تو وہ معنوب کیوں؟

سوچ سوچ کر وہ مذہل ہو جاتی مگر دل میں بیٹے الاؤ کو فرق نہ پڑتا۔ وہ اسی رفتار سے بیٹے جاتا۔

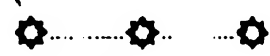
جب کوئی غم نہ تھا، وہ سوچتی نہ تھی، اب انکشاف کے نت نئے رنگ روز اترا کرتے۔ عورت کی دشمن عورت کا یہ بھیاں روپ اس کے تصور کی گرفت میں کبھی نہ آیا تھا۔ مسخر، تعجب، طنز، طعن، تہنہ... اتنے تیر اپنی فطرت کے ترکش میں سینے ہوئے عورت بظاہر کتنی صاف، اجلی اور معصوم ہے۔

کسی کو خبر نہ ہوتی اور اس کا دل پارہ پارہ کر دیا جاتا اور تیشہ محض ایک مسکراہٹ ہوتی۔ ایک تیکھی نظر لوگ خوش گمیاں کرتے ہوئے کسی شوگر کوٹہ بیٹے میں بھرا زہر اس کی

رگوں میں اتار دیتے۔ اس کے لیوں سے آدھک نہ نکلتی۔

اس کے سامنے بچوں کو لپٹا لپٹا کر چدھا جاتا۔ ان کے مستقبل کی باتیں کی جاتیں۔
"ماں" کی عظمت کو خراج تحسین پیش کیا جاتا اور بانجھ پن کے تصور سے بھی اللہ کی پناہ مانگی جاتی۔

دو لمحہ لمحہ کھلتی، قطرہ قطرہ کھلتی، روز مرنی، روز جیتی۔ وہ کسی کی شکایت کیسے کرتی؟
کس کو اپنی حیات کا دشمن قرار دیتی؟ کس پر اپنے قتل کا اہرام لگاتی؟ ٹوٹا ہوا دل نظر نہیں آتا،
اندھر مگر تے آنسو اپنا سراغ نہیں دیتے، لمحہ لمحہ مرنی زندگی کا قاتل کا نام نہیں لیتی۔ ہر چند کہ
قاتل غمخواروں کے سامنے ہی ہو۔ اس نے جانا تھا کہ جہنم کی دہکتی آگ اکثر عورتوں کا مقدر
کیوں ہے۔



زور دہم سہمی ہوئی زندگی ایک مرتبہ پھر بکھری تھی۔

"تانیہ!"

وہ ایم اے کے امتحانات سے فارغ ہوئی تھی، جب اماں نے اسے ایک کڑی
آزمائش کے سامنے لا کھڑا کیا۔

"ہم لوگوں نے بہت سوچا ہے سب گھروالوں نے رات دن بیٹھ کر حالات کا
جائزہ لیا ہے اور ہم نے فیصلہ کیا ہے۔"

انہوں نے ایک نظر اس کے معصوم چہرے پر ڈالی پھر جی کڑا کر کے بولیں۔

"اشعر کی دوسری شادی کر دی جائے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟" اس کے جو اس کچھ
دیر کو مسئل ہو گئے۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، کان سائیں سائیں کرنے لگے۔
انہیں کچھ جواب دیئے بنا وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کندھی چڑھائی اور پھوٹ پھوٹ کر
رونے لگی۔

اشعر۔ اشعر کی دوسری شادی اشعر اس کی آتی جاتی سانس تھا۔ سانس دو
انسانوں میں بانٹی جاسکتی ہیں؟ اشعر اس کے سینے میں دھڑکتا دل ہے اپنا آدھا دل کاٹ کر
بھلا دے کیسے دے دیتی؟ اس کی ہر خوشی ہر مسکان اشعر سے شروع ہو کر اشعر پر ختم ہوتی تھی۔

اس کی خوشیاں اس کی مسکراہٹ اس سے طلب کرتی تھیں۔
وہ زندگی کے سب سے مشکل سوڑ پر آکھڑی ہوئی تھی۔



وہ سب ذرا تنگ روم میں بیٹھ تھے۔

اماں! اباجی! انور بھائی! فاخرہ بھابھی! امزشہ پادشاہ عالیہ اور اس کا شوہر جمیل تانیہ
اور اشعر۔

اور ایسا تب ہی ہوتا تھا جب کوئی اہم فیصلہ زیر غور ہوتا۔

"بیٹے! اللہ نے بھی مرد کو چار عورتیں رکھنے کا اختیار دیا ہے۔ یہ اختیار بے وجہ نہیں
دیا گیا اس کے پیچھے ہزار باتیں پوشیدہ ہیں۔" اباجی بول رہے تھے۔ تانیہ جھکے جھکے بنا
آنسو بھری نظروں سے ان کا چہرہ تنگ رہی تھی۔ یہ وہی اباجی تھے جن کی کبھی دولاؤلی بہو ہوا
کرتی تھیں۔ اس کی جگہ اگر عالیہ ہوتی تو نجانے اباجی جمیل بھائی سے یہ سب کچھ کہتے یا
نہیں۔

"نسل بڑھانا ہر آدمی کی خواہش ہے اس خواہش کو خدا نے مرد کے دل میں
پرہیز چڑھایا ہے۔ وقتی بندھیوں کی خاطر اتنی بڑی خواہش کی قربانی دے بھی دے تو بعد میں
پکچتہ ہے ہی اس کا مقدر غمخیز ہے اور پھر سب جانتے ہیں تانیہ سے تمہیں محبت ہے۔ ہم
جس تانیہ سے محبت کرتے ہیں تو ہمارا حق ہے کہ جواباً تانیہ بھی ہمیں چاہے ہماری
خواہش سے کہ سمجھتے سمجھیں، بخوشی دوسری شادی کی اجازت دے۔ یہ کوئی گناہ نہیں خدا کا حکم
نہایت حق ہے۔ انسان کا وارث ضرور ہونا چاہیے جو اس کے نام کو آگے بڑھائے۔ بیٹا! تانیہ
ہم اس کا قصور میں سے اسے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ بولو اشعر بیٹے! تمہارا کیا فیصلہ ہے؟"
اشعر نے جیسے بولے سر کو اٹھا کر پہلی مرتبہ ان سب کے چہروں کو پارہی پارہی
دیکھا۔ حنا حنا برکھا صاف لیا چر دلا۔

"اباجی! دوسری شادی مرد کا اختیار ہے اس کا حق ہے لیکن مرد پر فرض نہیں ہے۔
اس نے اپنے آپ کو آقا بنے چاہے تو اپنا ہے چاہے تو چھوڑ دے یعنی اس کی اپنی خواہش
ہی اس کی خواہش صرف تانیہ ہے۔" تانیہ کے روتے ہوئے آنسو اب نہ بہ گئے۔ اس

نے سر جھکا لیا۔

”دوسری بات یہ کہ نسل بہت سے لوگوں سے قائم و دائم ہے۔ آپ کا نام آپ کے تین بیٹوں کو ملا اس سے آگے انور بھائی کے دو بیٹوں اور احمر کے دونوں بیٹوں سے انتشار اللہ چلتا رہے گا۔ یعنی آپ کے نام کی نسل کو ایک میرے دوسری شادی نہ کرنے سے کوئی خطرہ نہیں۔ تیسرے یہ کہ آیا میں اپنا نام آگے بڑھانا چاہتا ہوں یا نہیں؟ تو میرا جواب ہے میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں۔ ہر انسان کو مر کر فنا ہونا ہے، مٹی میں مل کر مٹی بننا ہے۔ اعمال کا سلسلہ دیں رک جاتا ہے تو نام دنیا میں چلے یا نہ چلے اس بات سے کم از کم مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرے دادا پر دادا کا نام مجھ سے چل رہا ہے لیکن میں انہیں نہیں جانتا صرف ان کے نام سے واقف ہوں جیسے میں اور بہت سے گزرے ہوئے لوگوں کے نام سے واقف ہوں تو پھر ان کی ارواح کو مجھ سے کیا حاصل ہے؟ میرے ہونے نہ ہونے سے کیا غرض؟ ان کے اعمال ان کے ساتھ گئے اور ہمارے ہمارے ساتھ جائیں گے۔ اس فانی دنیا میں ایک دن سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ لہذا میں ضروری نہیں سمجھتا کہ میری اولاد ضروری ہو۔ اپنے بچے بچوں کو میں اپنی اولاد کی طرح چاہتا ہوں، میری روح کی پیاس مٹ جاتی ہے۔ جس نشے کی طلب تم نہیں ہوتی وہ تانیہ کی محبت ہے۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں کہنا اور میرا خیال ہے اس بحث کو آج یہیں ختم بھی ہو جانا چاہئے۔ چیزوں کی تکرار مجھے پسند نہیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

”چلو تانیہ! مجھے نیند آرہی ہے۔“

کمرے میں آکر وہ اس کے قدموں سے لپٹ گئی تھی۔

”اشعر..... اشعر.....“ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اسے تکرار پسند نہیں، وہ

ایک ہی نام کی تکرار کئے جا رہی تھی۔

اس کا بس نہ چلتا تھا، وہ خود کو اس پر سے دار دے۔ خوشبو بن کر اس کے وجود

میں سا جائے۔

”تانیہ! تم سے بھی مجھے ایک بات کہنی ہے۔“

اشعر نے اسے اٹھاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھے۔

”اللہ نے انسان کو اپنی مرضی سے پیدا کیا، اپنی مرضی کی خوبصورتیاں دیں، اپنی مرضی کی محرومیاں بخشیں پھر انسان کی مرضی بنائی کہ وہ اللہ کی مرضی میں خوش ہے یا ناخوش۔ دونوں اختیار انسان کو بخش دیئے، اس لئے انسان اگر خود چاہے تو کوئی محرومی نہیں۔ کوئی ناخوشی نہیں، اس لئے اللہ کی رضا میں خوش رہو گی تو کوئی تمہیں ناخوش نہیں کر سکتا اور لوگوں کی خواہشات پوری کرتے چاہو گی تو کوئی تمہیں خوش نہیں کر سکے گا، سمجھیں۔“

اس نے روتے روتے مسکرائے کی کوشش کی اور اثبات میں سر ہلایا۔ اشعر نے ہولے سے اس کے کال پر چیت لگائی تھی۔



کچھ عرصہ اور بیٹا تانیہ کے رستے تاسور کا منہ کچھ عرصے کے لئے بند ہوا تھا کہ شہ پار دے ایک اور بچی کو جنم دے کر گھر کی خاموش فضا میں کنکر پھینک دیا اور تو اور تاخیر بجا بھی کی رپورٹ بھی پازینو آگئی۔

مرد ہوتا لاد ایک بار پھر دھک اٹھا۔

”شہ پار دہ!“ بچی کے لئے لائے گئے کنکس اسے دیتے ہوئے نجانے تانیہ کو کیا سوچیں تھی۔ ”شہ پار دہ! ہم ایک ہی گھر میں رہتے ہیں، تم اسے مجھے پالنے دو اسے مجھے دے دو پلیز۔“ شہ پار دہ چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گئی تھی۔ تانیہ کی آنکھیں بھری ہوئی تھیں۔

”اسے دودھ پالو گی؟ اماں بولی تھیں۔“

تانیہ کا سر جھک گیا۔

”دودھ شہ پار دہ پائے اور بچی کو تم سنبھالو تو تم ماں نہیں آیا بنو گی۔“

تانیہ کو ایسا لگا، اماں نے اسے کسی پہاڑ سے دھک دے دیا جو اور وہ گرتی چلی جا رہی ہو۔

”دوسرے کا بچہ سنبھالنے سے وہ اپنا نہیں بن جاتا تانیہ!“ اماں اس سے سخت خفا تھیں۔ اس نے ان کا سب سے قیمتی سب سے پیارا بیٹا اپنا بنا لیا تھا۔

”اور پھر ایک ہی گھر میں رہتے ہو تو سب بچوں کو اپنا جان کر پیار کر دے یہ تقسیم کیسی“

”ہاں اگر واقعی ماں بننا چاہتی ہو تو اشعر سے کہو دوسری شادی کر لے۔ اشعر کا بچہ واقعہ تبارا

بچہ ہوگا۔ خواہ سوتا ہی سکی۔

وہ بھاری قدموں سے چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی تھی۔ اماں نے اسے اسی کی نگاہوں میں گرادیا تھا۔

دراز کھول کر اس نے ایک چھوٹی سی بوتل نکالی۔ یہ بوتل اس کے دکھوں کا وقتی طمان تھی۔ وہ گولیاں پانی سے نکل کر وہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی تھی۔



آج اس کی شادی کی دسویں سالگرہ تھی۔ وہ صبح سے تیاریوں میں لگی ہوئی تھی۔ پارلر جا کر بال سننے اسٹائل میں سیٹ کروائے چہرے کا سماج کروایا۔ وہاں ہی ایک نوپسورت فیردزی رنگت کا لباس اور ہم رنگ سینڈل خرید لائی۔ یہ اشعر کا پسندیدہ رنگ تھا۔ اشعر کے آنے سے کچھ دیر قبل وہ نہا کر تیار ہو گئی۔ کلائیوں میں بھر بھر کر چوٹیاں پہنیں۔ آنکھوں میں کاجل بھرا۔ ہونٹ لپ اینک سے سجائے۔ اشعر کا گفٹ کیا: وہ ایک جیولری سیٹ پہن کر وہ بالکل دلہن لگنے لگی۔

اسی لمحے دروازہ کھول کر وہ اندر آیا تھا۔

"السلام و علیکم۔" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ "ہم..... کہیں جا رہے ہیں کوئی دعوت ہے؟"

وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اس کے قریب آگئی۔

"کیا خبر تھی ایک دن ایسا بھی آئے گا....." وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ "جب مجھے تم کو یاد دلانا ہوگا کہ....."

"اوہ گاؤ!" اسے اچانک سب یاد آگیا۔ "اوہ مائی گاؤ۔" آئی ایم ویری سوری تانیہ! ویری سوری! اس نے تانیہ کو پکڑ کر ایک چکر دیا۔

"خیر..... سب تادان بھر دیں گے مائی ڈیئر..... تھوڑا سا انتظار اور کرو میں ذرا ایک ہاتھ لے لوں پھر کہیں باہر چلتے ہیں ٹھیک۔"

اس نے مسکرا کر سر ہلایا۔

"میں بہت خوش ہوں تانیہ!" وہ اس پر ایک نگاہ ڈال کر بولا تھا۔ اشعر واقعی بہت

خوش تھا۔ انہوں نے بہت پر تکلف کھانا کھایا تھا۔ سائل پر گھومے تھے لاٹک ڈرائیو کو انجوائے کیا تھا اور خوش خوش واپس لوٹے تھے۔

"آج کا دن انجوائے کیا؟ سونے سے قبل وہ اس سے پوچھنے لگا۔

"ہاں مگر ایک چیز رہ گئی۔"

"اوہ رتنیلی! وہ کیا؟"

"میرا گفٹ! تم نے مجھے کوئی تحفہ نہیں دیا۔"

"آر یو سیریس؟" وہ ہنسا۔ "تم نے تو برسوں سے کسی چیز کا نام نہیں لیا۔ یہ آج

مجھے کا خیال کیسے آگیا۔ کب کیا چاہئے؟"

"سو کن۔" وہ قہقہا بخند ہو گئی۔

"واٹ؟ یہ کیا مذاق ہے؟"

"نہیں! حقیقت ہے۔ تمہیں اب دوسری شادی کرنی ہوگی اشعر.....! کیونکہ یہ میری واحد خوشی ہے۔ اگر تم مجھے خوش دیکھنا چاہتے ہو تو..... وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

"سمجھو میں تمہیں خوش نہیں دیکھنا چاہتا۔" تانیہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر اس نے اپنی بندھنی کھولی۔

"پھر میں موت کو ترجیح دوں گی۔" اس کی ہتھیلی پر نیند کی گولیوں سے بھری شیشی تھی۔

"تانیہ!" اشعر نے اس کے منہ پر پوری قوت سے تھپہ مارا پھر اسے خود سے لپٹا لیا۔

سب کے لئے یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ اشعر نے دوسری شادی کے لئے ہانی بھری تھی۔ ابا جی اور اماں کے چہرے پر خوشی کے رنگ بکھر گئے تھے۔ فاخرہ اور شہ پارو کی آنکھوں میں چمک آگئی تھی۔ انور، بھائی اور امیر عظیمس ہو گئے تھے اور تانیہ کو ایک ناقابل فہم عزت کا سامنا تھا۔ اماں نے اسے چند تھوڑی سی دیں۔

"اشعر کو دکھا دو۔ یہ لڑکیاں اچھے شریف گھرانوں کی ہیں۔ ان کے والدین اور بی شادی کے خواہش مند مرد کو دینے پر رضامند ہیں۔ اشعر سے کہو اپنی پسند بتا دے۔"

تانیہ نے لفافے میں سے تصویریں نکالیں۔ ایک کے بعد ایک دیکھتی رہی پھر سب تصویریں رکھ کر لفافہ اباں کو واپس کر دیا۔

”ان میں کوئی نہیں۔“ وہ اطمینان سے بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“ اماں حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگیں۔

”اشعر کے ساتھ بچے کی کوئی؟“ وہ انا انہی سے پوچھنے لگی۔ ”اشعر کی دہریہ اشعر کی نہیں میری پسند سے آئے گی اور میں اشعر کے لئے چاند تک توڑ لانے کی تمنا رکھتی ہوں۔“

”ہونہ! سو کن پسند کرو گی۔ اتنا بڑا دل ہوا ہے کسی عورت کا آج تک۔ ہر لڑکی رجسٹر کرتی جاؤ گی کہ اسی بہانے وقت لٹا رہے گی۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔ اس کے لبوں پر وہی ناقابل فہم مسکراہٹ تھی۔

”اشعر کے لئے اشعر بنتی تھی لڑکی ہونی چاہئے۔ دس برس پہلے وہ چوبیس سال کی عمر میں دولہا بنا تھا۔ ابھی محض چونتیس برس کا ہے۔ وقت اسے چھو کر نہیں گزرا۔ کیا کمی ہے اس میں جو اسے اچھی دہن نہ ملے گی۔ میں اس کے لئے حوروں جیسی دہن لاؤں گی تاکہ بچے خوبصورت ہوں۔ میں انہیں خوب پیار کروں گی وہ اپنی ماں سے زیادہ میری محبت کو مانیں گے اور اشعر۔۔۔ اشعر جانے گا کہ اس کی تانیہ کا دل کتنا بڑا ہے میرا اشعر ہمیشہ میرا رہے گا۔“



وقت گزرتا رہا اسے کوئی لڑکی پسند نہ آتی تھی۔ ہر کسی میں وہ کوئی خامی ڈھونڈ لیتی۔ اشعر نہس کر اس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کر دیتا۔ سب گھروالوں نے اس کو ذرا بڑی کا نام دیا۔ تانیہ کو کھنی اور مکار کے القابات سے نوازا گیا۔ وہ سنی ان سنی کرتی تھی۔

ایک روز دو کتابوں کی دکان پر کھڑی ایٹا پسندیدہ ماہنامہ لے رہی تھی۔ جب اس لڑکی پر نظر پڑی۔ تانیہ چند لمحوں کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ دس سال پہلے والی تانیہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ وہی شہد رحمت وہی سیاہ گھوڑا آنکھیں دہی دگش مسکراہٹ وہی کمال میں پڑتا گزرا۔

دو سب آج بھول کر اس کی سمت بڑھ گئی۔

”ایکسکس زئی۔ میرا نام تانیہ ہے۔ آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے یا نہیں آ رہا۔ آپ کا نام جاہن سکتی ہوں؟“

”قدیل!“ وہ مسکرا دی۔ ہر طرف جگہ جگہ ہی پھیل گئی۔

”کہاں رہتی ہیں؟“

وہ بڑی سادی لڑکی تھی جواب اپنا پتا تفصیل سے بتا دیا۔

”ایک بات کہوں اگر آپ برا نہ مانیں۔ اگر آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں تو پلیز۔“ قدیل کی نگاہوں میں چمک سی ابھری۔ لڑکیاں ایسی باتوں کا مطلب خود ہی سمجھ جاتی ہیں اس نے اپنا نمبر ایک چھوٹے سے کانڈ پر لکھ کر اسے تھما دیا۔ وہ خود بھی تانیہ کے چہرے مہرے اور لباس وغیرہ سے کافی مرعوب نظر آتی تھی۔

تانیہ وہ چھوٹا سا کانڈ منھی میں دبائے دکان سے نکل آئی۔ وہ بے حد خوش نظر آتی تھی۔



قدیل ایک خیم لڑکی تھی۔ اس کے ماں باپ غریبہ ہوا انتقال کر چکے تھے۔ وہ اپنی زندگی خالہ کے پاس رہتی تھی جو سلائی کر کے اپنا اور اس کا بوجھ اٹھاتی تھیں۔

خویرہ زوجان اور اچھی پوسٹ پر فائز اشعر کا رشتہ انہیں ایک نعمت غیر مترقبہ کی مانند لگا جیسے خالہ بھانجی کے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہیں تانیہ کے ہونے نہ ہونے سے غرض نہ تھی۔ قدیل کو اس کے ساتھ ایک گھر میں رہنے پر مطلق اعتراض نہ تھا۔ یہ رشتہ فوری طور پر منظور کر لیا گیا۔

تانیہ بہت خوش تھی۔ اس نے اشعر کے لئے بہترین انتخاب کیا تھا۔ ”قدیل سے بھی لڑکی بھلائی سکتی تھی اماں کو۔ چاہے کنوؤں میں ہائس ڈلو اتھیں یا چراغ لے کر پھرتیں۔ اشعر کے دل میں میری قدر و منزلت کس قدر بڑھ جائے گی جب وہ قدیل کو دیکھے گا۔ اس کے ساتھ وقت گزارنے کا تو میرا خیال پلں پلں اس کے ساتھ رہے گا۔“

وہ شادی کی فریادیں کرنے لگی۔

"اشعر کی دوسری سکھا قدیل کی تو یہ پہلی شادی ہے۔" اس نے کہا تھا۔ "اسے احساس نہیں ہونا چاہئے کہ وہ "نبرد" ہے۔"

فاخرہ بھابھی اور شہ پارہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی تھیں۔ تانیہ کو یک گونہ سکون محسوس ہوا۔

پھر سب تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ دلہن کے ملبوسات ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ تانیہ نے اپنے آدمے سے زیادہ زیورات بری میں رکھ دیئے تھے۔

"میں اپنا اصلی اور سچا زیور اسے دے رہی ہوں۔ یہ سونا چاندی کیا چیز ہے۔" وہ متانت سے بولی تھی۔

حق مہر پانچ لاکھ روپے سکھ رائج الوقت رکھا گیا تھا۔ یہ بھی تانیہ کی ضد تھی۔

اشعر بس خاموشی سے اس کی باتیں مانتا چلا گیا تھا۔ وہ ان دنوں کوئی روپوٹ لگتا

تھا۔ احساس و جذبات سے خالی انسان۔ بس اس کی خاموش نظروں سے عجیب سا دکھ

جھلکتا تھا پھر وہ دن آن ہی پہنچا۔ سب لوگ زور و شور سے بارات لے جانے کی تیاری کر

رہے تھے۔ تانیہ نے اپنا بیڑوم بھی نئی فوٹی دلہن کے لئے سجا دیا تھا۔ خود وہ چلی منزل پر اماں

کے کمرے کے برابر والے کمرے میں شفت ہو گئی تھی۔ ہر چند کہ اشعر نے اسے بہت منع کیا

تھا مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔

"اشعر" یہ کمرہ نئے شادی شدہ جوڑوں کے لئے کتنا اچھا ہے نا۔ یہ کھڑکی

جو چاند کو کمرے میں اتار دیتی ہے باغیچے کی جھنجھکی 'نرم' ہوا کا رستہ ہے۔ رات گئے اسے کھڑکی

میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے سے باتیں کرنا کتنا اچھا لگتا ہے پھر نیچے والوں کا شور شراب اس

کمرے تک نہیں آتا۔ ڈسٹ بنس نہیں ہوتی اور پھر

وہ آنکھوں میں بھرتے آنسوؤں پر قابو پا کر کچھ دیر کو خاموش ہو گئی تھی۔

"اور پھر کمرے میں کیا فرق پڑتا ہے۔"



اس نے اپنے پیچھے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ جلدی جلدی آنسوؤں کو ہتھیلیوں

سے سمیٹ کر وہ اندازہ لگانے لگی کہ کمرے میں کون داخل ہوا تھا۔ اتنی فرصت کسے تھی؟

"تانیہ!" اشعر کی آواز پر اس کی سسکی نکل گئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اس شخص

سے آنسو چھپانے کی اب کچھ خاص ضرورت نہ تھی۔

"رورہی ہو تانیہ! یہ تو تم نے اپنی خوشی کی قیمت نہی تھی پھر یہ آنسو؟"

"یہ تو خوشی کے آنسو ہیں اشعر!" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "تمہارا گھر پھر

نئے سرے سے بس رہا ہے۔ کچھ ہی عرصے بعد تم باپ ہو گے۔ میں... میں... سوتیلی بی

سنی... ماں کہلاؤں گی۔"

"تم تیار نہیں ہوئیں تانیہ!" وہ جیسے اس کی بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ "میری

بارات لے کر نہیں چلو گی۔ تمہیں تو اس موقع پر آگے آگے ہونا چاہئے۔ تانیہ!"

تانیہ نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکا دیں۔ بلیک سوٹ

میں میردن ٹائی اور جیب میں سچے میردن رومال کے ساتھ وہ حد درجہ وجیبہ لگ رہا تھا۔ سیاہ

خاموش آنکھیں اسے دیکھنے جا رہی تھیں۔

"اشعر" وہ بے اختیار ہو کر اس کے سینے سے جا لگی۔ "اشعر... خدا کے

لئے تم تو میرا مذاق مت اڑاؤ۔ ہاں یہ قربانی میں نے اپنی مرضی سے دی ہے۔ لیکن

نہری کسے میں آنکھیں بھی کھلی رکھوں کیا یہ بھی ضروری ہے؟ مجھے آنکھیں تو بند کر لینے دو

پھر شوق سے چھری چملاؤ۔"

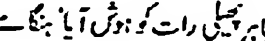
وہ اس سے الگ ہو کر دیوار سے جا لگی۔

"جاؤ اشعر... سب لوگ تمہارے خنجر ہیں۔ وہاں دلہن تم لوگوں کی خنجر ہو گی۔

دلہن کے دل کو کیسے کیسے دھڑکے ہوتے ہیں میں جانتی ہوں۔ ہر آہٹ پر کیسے گمانا جاتے

ہیں مجھے سب پتا ہے۔ جاؤ اشعر!"

وہ مڑی تو کمری خالی تھا۔ اشعر نئی دلہن کو بیاہنے جا چکا تھا۔



نجانے کتنے لمبے سر کے 'گھڑی کی سوئیاں کتنی بار گھومیں۔ وہ بے جان بے

حرکت 'بستر پر پڑی رہی پھر باہر پھیلی رات کو ہوش آیا ہنگامے جاگے شور و غل گھر میں پھیل

گیا۔

نئی دلہن گھر آئی تھی۔

تانیہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے روز حشر آ گیا ہو۔ وہ جلدی سے اٹھ کر کمرے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

عورتیں دلہن کو سیزھیاں چڑھا کر اوپر کی منزل پر واقع کمرے میں لئے جا رہی تھیں۔ ہنسی کی آوازوں سے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ کسی نے اس کو نہیں دیکھا کسی نے دیکھا بھی تو نظریں چرائیں۔

وہ ایک نیک لال شرارے میں لپٹے وجود کو اوپر جاتا دیکھ رہی تھی۔

دس برس کا منظر یوں نظروں کے سامنے ایسے آکھڑا ہوا تھا بیسے کل کی بات ہو۔ سرخ اتاری رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، ہونٹوں پر شرمیلیں مسکراہٹ سجائے وہ یونہی سیزھیاں ملے کر کے اوپر کمرے میں گئی تھی۔

"جانی یہ تم ہوتی؟" اشعر بہوت ہو گیا تھا۔ "یہ رنگ روپ؟" مسکراتا وجود واقعی میرا ہے۔"

اس کی جھکی چٹکیوں پر بوجھ بڑھ گیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔

"آج سے میری ہر جان تم پر نونے کی جانی!"

اور وہ دونوں زور سے ہنس دیے تھے۔

تانیہ روتے روتے ہنس دی پھر چونک کر آنسو صاف کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ خالی کمرہ اس کا دل چیرنے لگا دیواریں منہ کو آئے لگیں۔ پچھلے دس برسوں میں وہ کبھی اکیلی نہ سوئی تھی۔ اشعر کہیں بھی ہوتا، کہیں بھی جاتا، رات کو ہر حال میں پلٹ آتا تھا۔ وہ کبھی اپنے بیکے میں رات نہ رکھتی تھی۔ اسے اپنے کمرے اور بیون ساتھی۔ دونوں کے ہاں نیند نہ آتی تھی۔

اور آج جدائی کی پہلی رات تھی۔

وہ تنہا بیٹھی سسک رہی تھی۔ منہ کے سارے بدن ٹوٹ گئے تھے۔

"تانیہ! اس کے پیچھے آواز بھری تھی۔

اسے یوں لگا جیسے یہ اس کا وہم ہو، بھلا! اشعر اور اس وقت۔

وہ بجلی کی سی تیزی سے چلی۔ اشعر اس کے پیچھے کھڑا تھا اس کے پسندیدہ لباس میں۔ سفید کرتا شلوار اس پر کتنا بجا تھا۔ وہ اسے بس دیکھتی رہ گئی۔

"تانیہ! اس نے تانیہ کے ہر جیسے سر و ہاتھ تمام لیے۔

تانیہ نے اس کا ہاتھ چہرے پر رکھ لیا۔

"اشعر! تم یہاں کیوں آئے؟"

"بس ایک نظر تمہیں دیکھنے۔"

تانیہ ساکت کھڑی رہ گئی۔ وہ بس ایک نگاہ کی خیرات دینے آیا تھا۔ وقت کی ساری دولت اب وہ کسی اور کے نام لکھ چکا تھا۔

"اشعر! اس کے ہونٹوں پر بخود مسکراہٹ چٹکی۔" کسی جگہ تھیں میری پسند۔"

"چہ نہیں میں نے تو اب تک اس کو ایک نظر بھی نہیں دیکھا۔" وہ بے بسی سے

ہلا۔ "میرے ذہن میں تو تمہاری آنسوؤں سے بھری آنکھیں تھیں، میں اسے کیا دیکھتا۔"

"اشعر اشعر" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

اشعر نے گہری سانس بھر کر خود پر قابو پایا۔

"میں چلتا: دوں تانیہ! دم میری منتظر ہے۔"

تانیہ کو یوں لگا جیسے تیز دھار خنجر کا چمکتا پھل اس کے سینے میں اتر رہا ہے۔ اس کی سانسیں اکھڑ گئیں۔ وجود کپکپانے لگا۔

"اشعر! نہیں نہیں اشعر مجھے چودہ کرمت جاؤ۔ خدا کا واسطہ تم میرے

ہاں سے نہ جاؤ۔"

"تانیہ! خود کو سنبھالو۔" وہ پریشان ہو گیا۔ "کتنا سمجھایا تھا میں نے تمہیں۔"

"ہاں! اشعر! سمجھایا تھا بہت سمجھایا تھا مگر میں پکے ہو گئی تھی۔ میں۔ میں۔

دیوانی بن گئی تھی۔ میں وہ کی دیوانی بنا چاہتی تھی۔ میں جھوٹی ہاں بنا چاہتی تھی لیکن

اب اب میں تجھ نہیں جانتی۔ تجھ نہیں۔ میں بس یہ رات چاہتی ہوں۔ میں یہ رات

تمہارے ساتھ ہونا چاہتی ہوں۔ تمہاری دلہن بن کر۔ اشعر زندگی بھر رات اس کے

تو بسمہ کیوں مرتی؟

اس روز ایک عجیب بات ہوئی؟

میں صبح سویرے اپنے دروازے پر کھڑی سبزی والے سے سبزی خرید رہی تھی۔ جب میں نے بسمہ کو دیکھا۔ جس گھر کے دروازے پر کھڑی وہ سبزی والے کا انتظار کر رہی تھی وہ دینو کا کا کا تھا اور پچھلے کچھ دنوں سے خالی پڑا تھا، دینو کا کا کرائے دار کی تلاش میں تھا۔ مجھے اس کا دینو کا کا کے گھر دروازے پر کھڑا ہونا عجیب نہیں لگا تھا۔ صبح سویرے کا وقت تھا۔ گلی میں دودھ والے سبزی والے اور اخبار والے آوازیں لگا رہے تھے۔ ایک کونے میں وہ خاکروب بیٹھا سگریٹ نوشی کر رہا تھا جسے ابھی گلی کی جھاڑو لگانا تھی۔ گھروں میں ابھی مرد اور بچے پڑے سو رہے تھے اور وہ موتیا کی منہ بند کلی کی مانند شگفتہ شگفتہ اپنے دروازے پر کھڑی تھی۔ اس نے ہلکے کاسنی رنگ کا ایسا سوٹ پہنا ہوا تھا جو بالکل نیا معلوم ہوتا تھا۔ دونوں کلاٹیاں سفید اور کاسنی رنگ کی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ سلیقے سے بنی چوٹی آگے سینے پر پڑی تھی اور پتا دیتی تھی کہ بال ابھی ابھی سنوارے گئے ہیں۔ آنکھوں میں کاجل بھرا ہوا تھا۔ ہونٹوں پر بڑے بھٹے رنگ کی لپ اسٹک تھی۔ کانوں میں چاندی کے آدیز تھے۔ میں سبزی خریدنا بھول کر اسے دیکھنے میں اس قدر محو تھی کہ سبزی والے نے مجھے دو تین مرتبہ پکارا۔ میں نے جڑ بڑا کر اسے پیسے دیئے اور اس سے سبزی کی نوکری تھامی۔ اس نے سبزی والے کو اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا تو میں مڑ کر اندر چلی آئی۔

باورچی خانے میں نوکری رکھ کر میں باہر نکلی تو بسمہ کا سراپا میری آنکھوں میں محسوس

کام پارک میں جمع ہونے والے لڑکوں کا تھا۔ لڑکیاں عموماً آپس میں مل کر چھوٹے چھوٹے معدومانہ کھیل کھیلا کرتیں۔ ایک دوسری کا ہاتھ پکڑ کر وہ بڑا سا دائرہ بنا لیتیں اور پھر یونی گول گول گھومتے ہوئے نجانے کتنے گیت گایا کرتی تھیں۔ یوں گول گول ایک ہی دائرے میں گھومتے ہوئے وہ بہت خوش ہوا کرتی تھیں۔ گیت کے بول اور دھن تبدیل ہو جاتے تھے دائرہ وہی رہتا تھا۔ پھر بھی وہ گھومتی جاتیں گھومتی جاتیں۔ جانے وہ کون سا جذبہ تھا جس کے تحت وہ ایک ہی دائرے میں گھوم کر اور ایک سے گیت گا کر بھی خوش رہا کرتی تھیں۔ اس یکسانیت سے ان کا جی نہ اذیتا۔ پارک میں کھیلتے ہوئے لڑکوں کا مزاج اس کے برعکس تھا۔ انہیں ہر روز کوئی نیا کھیل درکار تھا۔ وہ کبھی کرکٹ کھیلتے، کبھی فٹ بال کبھی وہ پرندوں کے پیچھے ٹیلیس لئے پھرتے تو کبھی جاسن گرانے کی ترکیب سوچتے۔

اسے لڑکیوں کے کھیل اچھے لگتے تھے۔ وہ انہیں دیکھا کرتا۔ ان کے کھیلوں میں سکون تھا۔ محبت تھی۔ گریہ نہ تھی وہ ننھی 'گڑیا سی بچی' اسے بے حد پسند تھی جو روز اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر وہاں آیا کرتی تھی۔ وہ گول منول سی بچی جب ہنستی تو اس کے کشمیر کے سیبوں جیسے گال چمکتے اور ان میں گڑھا پڑتا۔ کبھی کبھار اس کا جی چاہتا کہ وہ اس بچی کو گود میں اٹھالے اور اسے پیار کرے۔ لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ اگر کہیں وہ رونے لگتی تو بڑا غصہ ہو جاتا! اسے کہاں بچوں کو خاموش کرانا آتا تھا۔

پارک میں کھیلتے ہوئے لڑکے اسے بالکل پسند نہ تھے۔ وہ اس پر ہنستے اور اس کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ "بابا آیا..... بابا آیا..... بڑھا بابا آیا....." وہ اسے دیکھ کر شور مچاتے، تالیاں پیٹتے۔ وہ ان کی حرکتوں پر خاموش رہتا لیکن اسے غصہ آتا تھا۔ اس کا جی چاہتا وہ زور دار آواز نکال کر انہیں ڈراوے یا گھاس پر پڑا، کوئی پتھر اٹھا کر انہیں مارنے کی دھمکی دے۔ لیکن پھر وہ ڈر جاتا۔ اگر وہ ایک مرتبہ انہیں ڈرا دیتا تو پھر وہ روز اسے ڈرانے کی نئی ترکیبیں سوچتے۔ اس کا پارک میں آنا وہ سمجھ کر دیتے۔ اسے پاگل قرار دے کر پتھر مارتا واجب سمجھتے۔ سو وہ انہیں کچھ بھی نہ کہتا وہ اسے بو کر خزاں کے موسم پر غور کرنے لگتا تھا!



صبیحہ لیبر روم میں تھی۔ واجد اور اماں باہر کارڈور میں پڑے ہوئے بیچ پر بیٹھے تھے۔ اماں کے ہاتھ میں بیچ تھی جس کے دانے تیزی سے گر رہے تھے۔ ان کا منہ بھی مل رہا

تھا۔ اور وہ خود بھی مل رہی تھیں۔ ان کے زور زور سے بیٹنے کی وجہ سے بیچ بھی مل رہا تھا۔ اور واجد بھی۔ لیکن وہ خاموش بیٹھا حالات پر غور کر رہا تھا۔ اس کا ذہن بالکل بلیک ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا سوچے کبھی اسے صبح کا خیال آتا۔ کبھی اپنے ہونے والے بیچ کا۔ کبھی ہاسٹل کے بل کا، کبھی آفس کا۔

ایک نرس بڑی غلٹ میں باہر آئی تھی۔ اماں اور واجد سرعت سے کھڑے ہو گئے؟ "آپ کی سسر کی نارمل ڈیلیوری پاسی بل (Possible) نہیں ہے۔ سیزر ہونا ہے یہ دوائیں لے آئیں۔"

اس نے ایک پرچی اسے تھمائی اور واپس اندر چلی گئی۔ واجد کا منہ کھلا رہ گیا۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اسے یہ بھی سمجھ نہ آیا کہ وہ کیا پوچھے۔

اماں اس کے پہلو میں ہکا بکا کھڑی تھیں۔ وہ پرانے زمانے کی خاتون تھیں۔ آپریشن کا تصور ہی ان کے لئے بعید از قیاس بات تھی۔ بلا پچہ پیدا ہونے کا آپریشن سے کیا تعلق؟ جو چیز خدا نے فطری طور پر اتار دی ہے اس کے لئے غیر فطری طریقہ کیوں اختیار کیا جائے؟

واجد دوائیوں کا بندوبست کرنے میں لگ گیا اور اماں جتنی بڑ بڑاتی رہیں۔ انہیں ڈاکٹر اور اسپتال والوں پر غصہ تھا جو محض جلدی کی خاطر یہ سب کر رہے تھے۔ ورنہ ان کے خیال میں تو وہ دونوں کی تاخیر بھی کوئی مسئلہ نہ تھی۔

واجد نے دوائیوں اور سیزرین کے لئے معقول رقم کا انتظام کیا۔ وہ لوٹا تو اماں وہاں نہ تھیں۔ آپریشن ہو چکا تھا۔ صبحہ کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔ اماں اس کے پاس تھیں۔

"اماں!" اس نے ایک نگاہ بوش سے بیگنی صبحہ پر ڈالی اور دوسری نظر اماں کے متے ہوئے چہرے پر۔ اسے خیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔

"اماں!" وہ پھر بولا۔

"بیٹی، دینی ہے!" وہ ٹھنڈے لہجے میں بولیں "ابھی نرس دیکھا کر گئی ہے!"

"اوہ!" اسے سکون محسوس ہوا "گویا سب کچھ نارمل تھا۔"

وہ ان کے قریب بیٹھ گیا۔

"بیٹی اور وہ بھی بڑے آپریشن سے۔" اماں کچھ خفا لگتی تھیں۔ "رہ پیہ پیہ بھی

باز پرس کرنے والا نہ تھا۔
 عظمیٰ سے اسے پتہ چلا تھا کہ شاملہ کو حلاق چھوٹا سی
 پائی تھی اور سب بھر بعد ہی آزادی کا پروانہ لے کر خوشی خوشی پرانی دنیا میں لوٹ آئے۔
 آنجل لہرات ہوئے رہنا اسے بہت بھاتا تھا۔ شاید اس کے شوہر کے گھر میں ایسی کھڑکی
 تھیں۔ جنہیں کھولنے پر ایسا رنگین سماں بندھ جاتا اور نظروں کے جام چلنے لگتے۔ یا شاید اس
 شوہر رنگین آنجل کی سرسراہٹ اور سیاہ چوٹی کی بلبلچی سے زیادہ کچھ چاہتا ہو اور وہ زیادہ کچھ
 شاملہ کے پاس نہ ہو۔ بہر طور کیا تھا اور کیا نہ تھا، یہ اس کا مسئلہ نہ تھا۔ اس کا مسئلہ وسیم تھا جو ایک
 فضول، بے مقصد اور گونگا عشق کئے جا رہا تھا اور دور سے نظر آتے چاند کا موازنہ اپنے طاق
 میں سجے چراغ سے کر رہا تھا جو اپنا خون دل جلا کر اس کے گھر آنگن کو منور کر رہا تھا!



وہ بہت خوبصورت لباس خرید کر لائی۔ گلابی رنگ کا لباس۔ ہر چند کہ اس کی قوت
 خرید سے کچھ باہر ہی تھا پھر بھی ماہرہ نے خود پر بہت جبر کر کے وہ لباس خرید ہی لیا تھا۔ وہ
 اگلے ماہ کا بجٹ اپ سیٹ کر چکی تھی مگر کہیں باہر جانے کے لئے کہے گی۔ آج کا دن اس کے
 لئے خاص تھا۔ آج اس کی سالگرہ کا دن تھا۔ ہلکا ہلکا میک اپ اس کے چہرے کو جلا بخش گیا
 تھا۔ اس نے اپنی سونے کی چین پینی اور کانوں میں چمکتے آویزے ڈالے۔ پھر آئینے میں
 اپنا سراپا دیکھ کر مطمئن ہو گئی۔ آج وہ کافی اچھی لگ رہی تھی۔ وسیم کے آنے کا وقت ہوا تو
 اسے گھبراہٹ ہونے لگی۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ وہ بار بار کچن میں جا کر پانی پینے لگی۔
 دل ہی دل میں اس نے خود کو کوسا۔ آنے والا اس کا شوہر تھا جس کی ہمراہی میں
 وہ دو سال سے زیادہ کا عرصہ بتا چکی تھی۔ ادھر وہ طرار لڑکی تھی جو ایک اجنبی سے آنکھیں
 لڑھکھکے سے نہ گھبراتی تھی اور بہت اعتماد اور ٹھسے سے کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوتی تھی۔ بھلا وہ
 اتنی کم اعتماد کیوں تھی کہ اپنے ہی شوہر کا سامنا کرنے کا خیال اس کا حلق خشک کر رہا تھا۔ وہ
 خود کو بار بار آئینے میں کیوں دیکھ رہی تھی؟ پھر اسے ایک خیال آیا۔ وہ چپکے کے روشن دان
 تک پہنچی اور باہر جھانکنے لگی۔ سامنے والی کھڑکی بند تھی۔ ماہرہ کو یک گونہ سکون کا احساس

جی۔ باہر کھڑے، وسیم کو، کیلئے کر وہ خوشدلی سے

توصیف کا جذبہ۔ ابھرا تو ماہرہ کو اگلے پچھلے سب مہینوں کا بھٹ بھول گیا۔

”ج میری سالگرہ ہے“ وسیم کو اپنی جانب بغور دیکھتا پا کر وہ شرما ہی گئی۔

”اوہ مجھے دھیان ہی نہیں رہا۔“ ”ورنہ میں تمہارے لئے پھول ہی لے آتا!“

”رہنے دیں پھولوں کو۔ ابھی ہم باہر جا رہے ہیں..... کھانا کھانے.....“

وہ کچھ لاڈ اور کچھ استحقاق سے بولی تھی۔

”ہاں ضرور۔“ میں نہا کر فریش ہولوں..... پھر چلتے ہیں!“ وسیم بھی خوش نظر

آتا تھا۔

ماہرہ کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ وہ خود پر مغرور ہونے لگی۔ اچھا لباس پہن کر وہ بھی تو اچھی نظر آ سکتی تھی۔ پھر جو بات گھر کی عورت کے اچھا لگنے کی ہے وہ ان بازاری قسم کی لڑکیوں کے حسن میں کہاں؟ افق پر چمکتا چاند تو ساری دنیا کے لئے ہوتا ہے۔ گھر کا چراغ تو بس گھر کے لئے جلتا ہے..... چاند اور چراغ کا مقابلہ کیا کرنا؟

وہ وسیم کے لئے چائے بنانے لگی۔ چائے بنا کر جب وہ ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوئی تو ایک لمحے کے لئے ڈگمگا گئی۔ وسیم کھڑکی میں کھڑا تو لیے سے بال خشک کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں شرارت تھی۔ ماہرہ چپ چاپ اس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”چپس“ سے اس کے اندر تمناؤں کے آگینے ٹوٹے، شائد آج گلابی لباس میں ملبوس تھی۔ دور سے وہ کسی آسمانی پری سے مشابہہ لگتی تھی۔ گلابی رنگ عجب بہار دکھلا رہا تھا۔ وسیم مڑا تو اس کی آنکھیں ماہرہ کے روپ کے لئے بے مہر ہو گئی تھیں۔

”وہ اس کے لئے بے مہر ہو گئی تھیں۔“ وہ اس کے ماتھ سے چائے کا کپ لے کر بولا ”آج

ماہرہ نہ جا سکیں گے“



”اس نے اپنی ڈگری نکال کر دیکھی۔ اسے اپنی ڈگری کو آزمانا تھا۔ اپنی رنگ لگی

نام کر دینا، بس آج رات مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ خدا کا واسطہ، تمہیں میری محبت کا واسطہ۔" وہ بالکل دیوانی لگ رہی تھی۔ اشعر پریشان ہوا تھا۔

"تانیہ! مجھنے کی کوشش کرو لوگ کیا کہیں گے؟"

"تمہیں مجھ سے زیادہ لوگوں کی پروا ہے مجھ سے زیادہ۔ میں سچ کہتی ہوں اگر تم مجھے تو میں... میں وہ سب گولیاں کھالوں گی۔۔۔ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

اسے قرار آ گیا۔ اندر اٹھتے ابال بیٹھے لگے۔ وہ بستر پر گر کر رہ پڑ گئی۔

"اچھا میری بات سنو۔" اشعر نے اس کے قریب بیٹھ کر اس کے ہال سیٹے۔ "اس کے کمرے میں خواتین میری منتظر ہیں، میں جاؤں گا تو وہ سب سونے کے لئے جائیں گی۔ تم سمجھتی ہو تانیہ بات۔ میں کچھ دیر وہاں بیٹھتا ہوں، جب تنہائی میسر آئے گی تو میں تمہاری طبیعت خرابی کا بہانا کر کے یہاں آ جاؤں گا۔ صبح جلدی اس کے کمرے میں چلا جاؤں گا۔ کم از کم دنیا والوں کی زبان تو بند رہے گی۔"

"تم آؤ گے نا؟" وہ بے یقین ہوئی۔

"میں ابھی آتا ہوں تانیہ! تاؤریٹیکس پلیز۔"

وہ اس کا کال تمہچا کر باہر نکل گیا۔

قدیل کے کمرے میں ذخیرہ بھانگی اور ہشے کی ایک اور بہن موجود تھیں۔ اس کے جانے پر وہ دونوں باہر نکل گئیں۔

وہ چند لمحوں کو ملوکی کیفیت میں کھڑا رہا پھر بیڈ کے کنارے تک گیا۔

"قدیل!" اس نے تذبذب سے پکارا تھا۔

"جی!" نہایت خوبصورت سریلی آواز تھی۔ "کہیے" جھٹکے ہوئے اعصاب چونک

اٹھے تھے۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔

خوبصورت بے باپ، مصدیت سے سجا چہرہ، ردیہ تھا۔ عری لہاس میں وہ قدرت کا شاہکار لگ رہی تھی۔ سرخ بندوبست سے بھرے آنکھوں نے چہرے کو اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ ماتے پر سجاوٹ، نازک اور نازک سی گردن سے لپٹا گلو بند سب کے سب اس حسن بے دارغ، آفراتیسین پیش کر رہے تھے۔ بائیسپے کی جانب کھلتی کھڑکی سے ہوا

پاکیزم و ملائم جھوٹا رات کی رانی کی مہک سینے، شرارت سے مسکراتا اندر چلا آیا۔ کمرے کی ہر شے مسکرائی تھی۔ اشعر بھی۔ قدیل نے مسلسل خاموشی سے گھبرا کر نگاہ اٹھائی اور اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر جلدی سے نظریں جھکا لیں۔

اشعر نے ہاتھ بڑا کر اس کا کال دھیرے سے چھوا، وہ خود میں سمٹ گئی۔ وہ حسن بے مثال اس کا تھا، وہ حسین وجود اس کے نام لکھا جا چکا تھا۔ وہ اس کی دسترس میں تھی۔

گہری سانس بھر کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں... میں آتا ہوں قدیل! سونامت۔"

وہ پاٹ کر کمرے سے نکل گیا۔



دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو آس و نراس کی کیفیات میں جمبوٹی تانیہ کے مردہ ہوتے تن میں جان پڑ گئی۔

"اشعر!" وہ دوڑ کر اس تک گئی۔ وہ اسے لئے لئے بیڈ تک چلا آیا۔ دروازے سے گولیوں کی شیشی نکال کر دو گولیاں نکالیں اور پانی کا گلاس بھرنے لگا۔

"تم تھک گئی ہو تانیہ! تمہیں نیند کی ضرورت ہے، تمہاری حالت ٹھیک نہیں۔ یہ!۔ اس نے گولیاں اس کی سمت بڑھائیں۔ وہ فوراً انہیں نگلی گئی۔

"اب آرام سے سو جاؤ تانیہ! میں یہاں تمہارے پاس ہوں۔" وہ اس کے قریب بیٹھ گیا اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔

چند منٹوں میں وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر سو رہی تھی۔ اشعر نے ایک نگاہ اس پر ڈالی اس کے سونے کا یقین کیا اور جلدی سے اٹھ کر لائٹ بجھا دی پھر وہ بے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

اور اوپر جانے کی جلدی میں وہ سوئی ہوئی تانیہ کے سر ہانے سے گولیوں کی شیشی اٹھا، بھی بیبول گیا تھا۔



دل کا مقدمہ ہار کر

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ جلد عروسی میں میری منتظر تھی۔ دروازہ بند کر کے میں چند لمحوں تک دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ کچ تو یہ تھا کہ میرا دل آج عام ڈگر سے ہٹ کر دھڑک رہا تھا۔ شور و اشعار میں ایک بڑی بہت بڑی تبدیلی کا گہرا احساس بسا ہوا تھا۔

آج کے دن سے زندگی بدل گئی تھی۔ جیسے نئی زندگی شروع ہوئی تھی۔ نئی زندگی کی ابتداء اور ساتھ دینے کے لئے ایک حسین ہم سفر..... شادی انسان کے لئے کس قدر خوش کن احساس ہے۔ میں دیر سے دیر سے چلتا ہوا اس تک پہنچا اور آہستگی سے اس کے قریب بیٹھ گیا۔

اس کی چوڑیاں ہولے سے نہیں تو مجھے اس کے وجود میں ارتعاش کا احساس ہوا۔ لے گا ابی گھونگٹ کے پیچھے چمپا وہ چہرہ اپنی رونمائی کا منتظر تھا۔
”کیتی آرا!“ میں صرف اس کا نام جانتا تھا۔ وہ کیسی نظر آتی تھی وہ کیسے ہنستی تھی کیسے دیکھتی تھی کیا سوچتی تھی؟ میں کچھ نہ جانتا تھا۔

مجھے تو صرف اتنا علم تھا کہ میں نے دکالت کا امتحان پاس کیا تھا اور اماں نے مجھے لڑکی پسند کر لینے کی نوید سنائی تھی۔ دو مہینے بعد وہ اسے بہو بنا کر لے آئی تھیں۔

وہ میرے لئے نا آشنا تھی لیکن نکاح کے چند بولوں میں جو تعلیم طاقت ہوتی ہے اسے میرا وہاں وہاں محسوس کر رہا تھا۔

”کیتی!“ میں نے اسے پکارا۔ میرے لہجے میں استحقاق تھا۔
مجھے خود پر حیرت ہوئی مجھے لگا ہماری برسوں کی آشنائی تھی۔ میں نے اس کا محو بحث اٹھایا اور میرے لبوں پر مسکراہٹ چمکنے لگی۔

وہ میری اماں کا انتخاب تھی۔ کسی تراشیدہ ہیرے کی مانند دک رہی تھی۔ میرے دل پر جو ایک انجانے سے خوف کا بادل چھایا ہوا تھا چھٹ گیا۔ میں جو پورے دن کا تھکا ہوا تھا بالکل فریش ہو گیا۔ اس کی نازک انگلی میں سونے کی انگوٹھی پہنا کر میں نے اس سے چند ایک باتیں کیں تو وہ قدرے مطمئن اور قدرے با اطمینان نظر آنے لگی۔

”کچھ ہی دیر میں نا آشنا اور اجنبیت کی ٹھن ہماڑی مسکراہٹوں اور دبی دبی فنی کے روزن سے نکس بھاگی۔

ہم ایک دوسرے کو ہمیشہ سے جانتے تھے۔

ہم ایک دوسرے کے بنا ہمارے تھے۔

کیتی آرا، میری زندگی کا دوسرا نام تھا۔



”کیتی!“ میں آفس سے لوٹا تھا۔

میری عادت رانج ہو چکی تھی۔ میں گھر پہنچنے ہی اسے آوازیں دینے لگتا تھا اور ہماری شادی کو ٹھنک دو باہوئے تھے۔

”لڑکے! پہلے پورا گھر میں داخل تو ہوا کر۔“ اماں جو محن میں بچے تخت پر ناہنا مسرک اذان کے انتظار میں بیٹھی تھیں مجھے ٹوکے بنانہ روکیں۔

”اسلام و ملہم اماں۔“ جیسے پتا لازمی امر تھا۔

اند۔ سے آتی گیتی آرا شرارت سے مسکرا دی تھی۔ میں نے اماں کی نظر پھا کر سے گفتگو کی طرح آنکھ ماری۔ اس نے معنوی گفتگو سے مجھے گھورا اور کچن کی سمت مڑ گئی۔

”کیتی! بچے کو پانی پاتا تھا ہارا لوٹا ہے۔“

اماں نے نیت باندھنے سے قفل کہا تھا۔

اماں کا نیت باندھنا تھا۔ میں جھپاک سے چکن میں جا گھسا۔ وہ میرے لئے

شریت بتا رہی تھی۔

”خیر سے وکیل ہیں جناب!“ وہ بیٹنی گھولتے ہوئے بولی۔

”جی ہاں می لارڈ! ہرجرم کی سفائی پیش کر سکتے ہیں پھر بھی آپ می لارڈ ہیں۔
سزا سنا سکتے ہیں۔“

”یہ شریت پلی لیجس بھی سزا ہے آپ کی۔“

”اوہو۔“ میں نے مایوس سے کہا۔ ”میں سترلا نہیں ہوں می لارڈ۔ مجھے تو بانہوں
کی جتھ کڑیاں لگا کر کمرے میں قید کی سزا سنا ہے۔“

”بولتے بہت ہیں آپ“ اس نے مسکراہٹ دبا کر مجھے گھورا۔

”وکیل ہوں می لارڈ!“

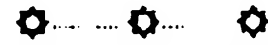
اسے ہنسی آگئی۔ میں بھی ہنسنے لگا۔

”سزا قید کی نہیں ہے۔“ پھر وہ بولی۔ ”کہیں گھمانے لے کر چلیں۔“

”جو جہم جناب کا‘ بحرم کو لباس تبدیل کرنے کا موقع دیا جائے۔“ میں نے شریت
گھونٹ گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

”ضرور کیجئے خیالات تبدیل کرنے کی اجازت نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولی۔

میں کورٹش بجالایا۔



کیٹی زندگی کا جزو خاص تھی۔ اس کے بنا کچھ سو جھٹائی نہ تھا۔ شادی کو تین ماہ ہو
چکے تھے۔ میں نے اسے میکے میں رہنے نہ دیا تھا۔ اپنے ساتھ لے کر جاتا تھا۔ گھر والوں
سے نا کر اپنے ساتھ ہی واپس لے کر آیا کرتا تھا۔

اماں کو میرا یہ انداز پسند نہ آیا۔

”بختیار! ایک دن انہوں نے مجھے اپنے پاس بٹھالیا۔

کیٹی عشاء کی نماز پڑھ کر میرے لئے روٹیاں پکا رہی تھی۔

”بیٹا! شادی ہو جانے سے لڑکے کی زندگی پر اتنا اثر نہیں پڑتا جتنا کہ لڑکی کی
زندگی پر پڑتا ہے۔ لڑکا اپنے گھر‘ اپنے گھر والوں میں اپنی جگہ پر رہتا ہے اور لڑکی! جیسے کسی

پودے کو جڑوں سمیت اکھیر کر کسی دوسری جگہ نئی مٹی میں لگا دو۔

نئی جگہ بے شک پہلی جگہ سے زیادہ اچھی ہو نئی مٹی بے شک پہلی والی مٹی سے
زیادہ نرم‘ زیادہ زرخیز ہو‘ مگر بیٹا‘ پودے کو پھر سے جڑ پکڑنے میں کچھ وقت لگتا ہے۔ بے
پارہ سہم جاتا ہے‘ مرتبہ نئے لگتا ہے۔ رگوں کے ٹوٹنے کا درد دیرے دیرے زائل ہوتا ہے۔
لڑکے کا کچھ نہیں جاتا۔ لڑکی ماں‘ باپ‘ بہن بھائی سے چھڑتی ہے۔ مانو‘ تازک
تازک رکس کسی نے ایک جھٹکے میں توڑ ڈالی ہوں۔ اس درد کو محض عورت کے لئے مخصوص کیا
ہے خدا نے ہاں۔“

اماں کو نبھانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ ان کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ میں خاموشی سے
بیناسن رہا تھا۔ جانتا تھا جو کچھ وہ کہتا چاہتی تھیں‘ ابھی باقی تھا۔

”تین ماہ سے بچی اپنے والدین سے ماں جاہوں سے دور ہے۔ ترپتی نہ ہوگی؟“

”میں ملو کر تو لاتا ہوں اماں!“ میں نے کمزور سے احتجاج کیا۔

”بیاس کو پانی کی جھٹک دکھا دو تو کیا پیاس بجھ جاتی ہے۔ بختیار؟“

میں لاجواب ہو گیا۔

کیٹی آ کر کھانا لے آئی تھی۔ میں اور اماں خاموش ہو گئے۔ وہ دسترخوان لگانے
لگی۔ میں نے اس کی جھکی ہوئی پلکوں کو دیکھا۔ وہاں نمی چمک رہی تھی۔ غالباً میری اور اماں
کی گفتگو اس نے سن لی تھی۔ میرا دل بے چین ہو گیا۔

”کیٹی آرا! آؤ بیٹا تم بھی کھانا کھاؤ۔“

اماں نے اسے کھانا لگا کر واپس جاتے دیکھا‘ تو پکارا۔

”مجھے بھوک نہیں ہے اماں! میں تھوڑی دیر سے کھانوں گی۔“

وہ بہانہ بنا کر چلی گئی۔ میں نے سنا تھا اس کا لہجہ بھی نرم تھا۔

مجھ سے زیادہ نہ کھایا گیا۔ چند تھپے لے کر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیٹی کو چند روز کے لئے اس کے میکے چھوڑ آؤ۔ بچی تازہ دم ہو جائے گی۔“

اماں نے میرے کمرے سے نکلنے سے پیشتر آخری بات یہی کہی تھی۔

میں رات کو اپنی تمام فکڑ مٹا کر سونے کا عادی تھا۔

قدوے تاخیر سے بستر پر آیا تو وہ جاگ رہی تھی۔

میں اپنی جگہ پر دراز ہو گیا۔ وہ بے نیاز بنی رہی۔ میں نے اس کی موٹی سی چوٹی پکڑ کر اسے کھینچا۔

”ہائے بختیار! کیا کرتے ہیں؟“

”ادھر آؤ۔“

”آ جاتی ہوں۔“ وہ سرک کر میرے پاس ہو گئی۔

”کھانا کھایا؟“

”نہیں۔“ وہ قدوے تال سے بولی۔

”کیوں؟ موٹی ہو گئی ہو کیا؟“

”بھوک نہیں ہے۔“

”کہاں چلی گئی۔ تمہارے بدلے میکے رہنے تو نہیں چلی گئی۔“

اس نے میری بات کا جواب دینے کی بجائے مسکراہٹ چھپاتا ضروری سمجھا۔

”اماں سے میری شکایتیں لگاتی ہو۔ نہیں!“ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

اس نے اپنی سیاہ موٹی موٹی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکا۔

”میں آپ کو کیسی لگتی ہوں؟“

”کیسی؟“

”شکایتیں لگانی والی؟“

”ہاں لگتی ہو گھنسی سی!“ اب کے میں نے مسکراہٹ چھپا کر تنبیہ کی سے کہا۔

بس لمحہ بھر کی بات تھی۔ کتنی آرا پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

”ہائیں۔ ارے بھئی..... اوفو۔“ وکیل صاحب کے طوطے اڑ گئے۔ ”ارے

کتنی ارے یا! مذاق کر رہا تھا تمہاری قسم یہ دیکھو تمہارے سر کی قسم میں تو ذاتی مذاق کر رہا

تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں کل تمہیں تمہارے میکے چھوڑ کر آؤں گا۔ پورے بیٹے کے لئے۔“

آنسوؤں کی لڑی لڑی کا ایک ٹوٹی۔ دونوں پر مسکراہٹ تھپی۔

”سچ کہہ رہے ہیں؟“ وہ ذاتی خوش ہو گئی تھی۔

میرا دل تنجانے کیوں ادا اس ہو گیا۔ اس کے چلے جانے کا خیال میرے لئے سوبان روح تھا۔ وہ خوش ہو رہی تھی۔

”ہاں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔“ میں تنبیہ کی سے بولا۔ پھر قدوے تاخیر سے میں نے اسے پکارا۔ ”کتنی؟“

”جی؟“ اس کا لہجہ فریض ہو چکا تھا۔

”رہ لو کی میرے بغیر پورا بخت؟“

”آپ روز مٹے آئے گا۔“

”اور راتیں۔ کیسے کٹیں گی؟“ میں نے شکایتا کہا۔

وہ کچھ نہ بولی بس مسکرا دی۔

اسے اتنا خوش دیکھ کر میں نے بھی منفی خیالات کو سر جھٹک کر باہر نکال پھینکا۔

”اچھا چلو کھانا لے کر آؤ۔“ میری بھوک جاگ اٹھی تھی۔

”اس وقت دو بجے؟“ وہ گھبرا گئی۔

”دو بجے بھوک لگی ہو تو کیا کریں۔ بھوکے سو جائیں؟“

”وکیل صاحب! اماں جاگ جائیں گی۔“ اس نے میری ٹھوڑی پیار سے چھوئی۔

”تو کیا ہوا۔ وہ پکار کر یہی پوچھیں گی! کون ہے؟ تم کہنا میں ہوں اماں کتنی! دو

نہیں گی اس وقت کیا کر رہی ہو؟ تم کہنا کھانا کھا رہی ہوں اماں..... بھوک لگی ہے۔“

وہ مجھے غور نے لگی۔

”یہ کیوں نہ کہوں کہ وکیل صاحب کو بھوک ہے؟“

”اماں کہیں گی اتنی دیر تک؟ کتنی کیوں تو میرے بیٹے کو۔“ میں ہنسا۔

وہ مجھے گھورتے ہوئے باہر چلی گئی۔

ابھی اس نے کچن کی لائٹ جلائی تھی کہ اماں کی پکار آئی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں! اماں کتنی؟“

”کتنی! اس وقت کیا کر رہی ہے بیٹا؟“

دو چہلے کے لئے خاموش ہو گئی۔ میرے لب مسکرا رہے تھے۔
 "کھانا کھا رہی ہوں اماں۔ بھوک لگی ہے۔" پھر اس کی آواز آئی تھی۔
 اور میں تجھے میں منہ چپا کر ہنسنے لگا۔



کیتی سیکے چلی گئی۔ میرا سکہ میرا جین میری نیندیں۔ سب ہی کچھ ساتھ لے گئی۔
 میں جب اسے چھوڑنے گیا تھا تو اس کے گھر والوں نے میری اچھی بھلی دعوت کر
 دی تھی۔ میں کیتی کو بتا آیا تھا کہ اب میں اپنے مہر بعد ہی آؤں گا۔
 "کیوں بھئی؟" وہ بے چین ہو گئی تھی۔ "گھر اتنا دور تو نہیں۔"
 "بات پاس اور دور کی نہیں ہے کیتی! زندگی میں کچھ اصول ہونے ضروری ہیں۔
 مرد روز روز سسرال میں بیٹھا اچھا نہیں لگتا۔ بے وجہ کے تکلفات سے گھر والوں کی روئین بھی
 زہر بڑھاتی ہے اور روز سسرال میں دعوتیں اڑا کر اپنی حیثیت کھوتا ہے۔"
 مجھے اماں کی کی گئی نصیحتیں یاد آ گئی تھیں۔
 "کچھ سمجھیں؟" مجھے اس کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر ترس بھی آیا تھا۔
 "سب کچھ دیکھ صاحب!" اس نے سر جھٹک دیا تھا۔

اور اب اسے مجھے چار روز ہو گئے تھے۔ میں ٹھیک سے سو نہیں پا رہا تھا۔ دو روز
 سے میں نے شیو نہیں بنائی تھی اور کل صبح ناشتے کے بعد کچھ نہیں کھایا تھا۔ مجھے کیتی کی جدائی کا
 بخار ہنہ گیا تھا۔

آفس سے واپسی پر میں نے بائیک دوڑائی اور محض بیس منٹ میں اس کے سیکے جا
 پہنچا میں نے تیل بھرائی۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ ہرے سوٹ میں ملیں دو ساتھی
 کمزری مسکرا رہی تھیں۔

"نہیں!" میں نے اسے پچاسی نظروں سے دیکھا۔

"جی!" اس کی پلکیں لرز رہی تھیں۔

"تم جانتی تھیں۔ میں آؤں گا؟"

"جی جانتی تھی۔"

"گھر چلیں۔"

"میں امی کو بتا کر آتی ہوں۔"

دو اندر جا کر چند لمحوں میں اپنا بیک اٹھائے واپس آ گئی۔ اچک کر میرے پیچھے
 بیٹھی اور مجھے تمام لیا۔ میں بائیک اسٹارٹ کر چکا تھا۔



تمام رات ہم دونوں ہنستے رہے۔ بسا اوقات فنی بہت سی باتوں کا اعتراف ہوتی
 ہے۔

آفس میں اماں کا فون آیا تھا۔ کیتی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اسے ڈاکٹر کے پاس
 لے کر جانا تھا۔

"اماں۔ اماں کیا ہوا اسے؟" میں بری طرح گھبرا گیا تھا۔ "میں اچھا بھلا چھوڑک
 آیا ہوں۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوا۔" اماں پر سکون تھیں۔ "تم شام کو کسی اچھی لیڈی ڈاکٹر سے
 ٹائم لینے آؤ۔"

"شام میں ابھی آ رہا ہوں اماں"

"ارے کوئی ضرورت نہیں۔ دوڑے چلے آئے کی۔" اماں بھٹک گئیں "وکالت
 پڑھ گئے عقل نہ آئی۔ میں نے کہا ہے کسی لیڈی ڈاکٹر سے ٹائم لینے آؤ۔ باپ بنے والے
 ہو۔"

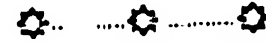
انہوں نے فون بند کر دیا تھا۔

میں ریسیدور تھا۔ اس باعث بینار با گیا۔

"باپ۔۔۔ باپ۔۔۔" میں نے دل تباہی میں خود کو باپ بننے دیکھا۔
 میرا دل فرط سرت سے سرشار ہو گیا۔ کیتی میری بچے کی ماں بننے والی تھی اور اماں مجھے شام کو
 آنے کا کہہ رہی تھیں۔

"معد ہو گئی!" میں اسی وقت آفس سے نکل لیا۔ راستے میں ڈیروں پھل خرید کر
 میں گھر پہنچا تو واقعی کیتی کو پیاروں کی طرح بستر پر لیٹا ہوا پایا۔

"گیتی۔" میں نے قریب بیٹھ کر پیار سے اس کی پیشانی چھوئی۔ "کیا ہوا ہے؟"
 "چکر آ رہے ہیں۔" وہ نقاہت سے بولی۔ "سنگ کے قریب گر گئی تھی۔"
 "گر گئی تھیں؟" میرا دل دھک سے رہ گیا۔ "بچے کو تو کچھ نہیں ہوا؟"
 ہر چند کہ میرا سوال اتنا احمقانہ تو نہ تھا لیکن اماں اور گیتی دونوں ہنس دی تھیں۔



میں اس کا خیال رکھنے لگا۔ اتنا خیال کہ بسا اوقات وہ زچ ہو جاتی اور کبھی بکھارتو
 اماں بھی ناراض ہو جاتی تھیں۔

صبح میں اس کے لئے مالے کا رس نکال رہا تھا جب اماں میرے لئے ناشتہ
 بنانے کچن میں آئیں۔

جب سے گیتی کی طبیعت خراب ہوئی تھی میں نے اماں سے کہہ دیا تھا کہ کھانا اماں
 پکایا کریں۔

"بختیار! اماں مجھے دیکھ کر چونک گئیں۔" کیا کر رہا ہے؟"
 "گیتی کے لئے جوس نکال رہا ہوں اماں! میں اپنے کام میں منہمک تھا۔" ہائیں
 تو تو بالکل ہی جو رد کا غلام ہو گیا ہے۔ بختیار! اماں تملای گئیں۔

"کیا ہے اماں؟" مجھے برا لگا۔ "وہ میرے دیکھ دو کی ساتھی ہے تو کیا میں اس
 کے دیکھ دو میں شریک نہ ہوں؟ شوہر بیوی کا خیال رکھے تو وہ جیون ساتھی ہونے کا حق ادا
 کرتا ہے اس کا غلام تو نہیں بن جاتا۔"

"اچھا میرے دیکھ دو۔ چل نکل یہاں سے۔" انہیں ہنسی آ گئی۔

میں جوس لے کر کمرے میں آیا تو وہ سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کھنڈی زدوری
 دیکھ کر میرا دل سخت افسردہ ہوا۔ تھوڑے سے دنوں میں کالوں کے غلاب مر جھگئے تھے۔

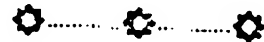
"گیتی۔" میں نے پیار سے اسے جگایا۔ "تو جوس پی لو۔ پھر ناشتہ دیر سے کر لیا۔"
 وہ اٹھی اور مجھے دیکھ کر سخت حیران ہوئی۔

"آپ آفس نہیں گئے؟"

"بس جا رہا ہوں۔ تمہارے لئے جوس نکال رہا تھا۔"

میں نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔
 "اوہ بختیار! آپ تو حد کرتے ہیں۔" وہ زچ ہوئی۔ "یہ کام میں خود بھی کر سکتی
 تھی۔ خواہواؤ آفس سے لیٹ ہو رہے ہیں۔"
 "کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں کام دہام کرنے کی۔۔۔۔۔ آرام سے لیٹی رہا کرو۔"
 "سب کام اماں پر چھوڑ دوں؟ ان کی عمر ہے کام کرنے کی؟"

"میں کام کے لئے عورت رکھ دیتا ہوں۔ بہر حال تمہیں کام کرنے کی ضرورت
 نہیں خود کو بھی نقصان پہنچاؤ گی اور میرے بچے کو بھی۔"
 "بہت خوب وکیل صاحب! وہ فٹکلی سے جوش پیئے لگی۔"



سفیان ہماری زندگی میں داخل ہوا اور اماں خاموشی سے چلی گئیں۔ بیٹے کو پانے
 کی خوشی اتنی زیادہ تھی کہ ہمیں اماں کی جدائی کا غم شدت سے محسوس نہ ہوا۔ ہم ایک دوسرے
 میں محکم تھے۔ زندگی کا وہ دور حسین ترین تھا۔ میں گیتی اور سفیان۔
 زیست میں مزید کوئی طلب نہ تھی کسی شے کی کمی کا احساس نہ تھا۔ ہر جانب ہر سو
 محبت ہی محبت تھی۔

سفیان سال بھر کا تھا جب گیتی کی طبیعت پھر خراب رہنے لگی۔ میں ان دنوں اپنے
 کام میں از حد مصروف تھا۔ وہ بے تحاشا محنت طلب دور تھا جس پر میری آئندہ حیثیت کا
 دار مدار تھا۔ میری توجہ گیتی اور سفیان پر کم ہو گئی۔

"بختیار۔" اس دن اس نے سویرے ہی سویرے پکارا تھا۔

"ہوں کہو؟" میں الماری کھولے کھڑا تھا۔ آفس جانے کے لئے کپڑوں کا انتخاب
 کر رہا تھا۔

"یہ۔۔۔ ذرا سفیان کا فیڈر بنا دیں۔ میری بہت نہیں ہوتی اٹھنے کی۔"

"گیتی پنیز۔" مجھے آج جلدی جانا ہے۔ پہلے ہی لیٹ ہو رہا ہوں۔ تم تھوڑی سی

بست کرو جانو! میرے لئے ناشتہ بھی بنا دو۔ میں بس ابھی نما کر لیتا ہوں۔"

میں جھپاک سے باتیں دوں میں تھس گیا۔ نہادھو کر تیار ہو کر میز تک آیا تو وہ ناشتہ

کی چکی تھی۔

”دش گز۔ وڈر نقل لیڈی!“ میں مسکرایا۔

اس کی طبیعت واقعی خراب تھی۔ وہ مسکراتک نہ سکی۔

”میں کوشش کروں گا کہ شام میں جلدی آؤں۔ ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔“ میں نے اسے تسلی دی۔

”بختیار! ڈاکٹر کے ہاتھ میں کچھ نہیں یہ دن تو یوں ہی گئیں گے۔“ وہ اسی سے بولی تھی۔

”اوکے جانو! چلتا ہوں اپنا خیال رکھنا اللہ حافظ!“ میں اس کا کمال چھو کر بریف کیس اٹھائے باہر نکل گیا۔

”اللہ حافظ!“ وہ بولی تھی۔



سفریان کے بعد ارماد اور ارماد کے بعد ایمان اور فرقان..... زندگی سے آٹھ سال یوں نکلے کہ کوئی آہٹ چاہ تک سنائی نہ دی۔

میں ہر ستر بختیار احمد جیسے ہواؤں میں اڑتا رہا تھا۔ کبھی جیسی شریک سفر واقعی قسمت والوں کو ملتی ہے۔ اس نے کبھی گھر کی کوئی ذمہ داری مجھ پر نہ ڈالی تھی۔ میرے مستقبل کے لئے وہ مجھ سے زیادہ فکر مند رہا کرتی تھی۔ یہ حقیقت تھی کہ کبھی نے میرے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ شادی کے بعد میں نے محبت، چاہت اور فرصت کے محض دو سال اس کی جھولی میں ڈالے تھے اور اس نے اپنی محبت، چاہت اور توجہ سے ان دو سالوں کو سرب دے کر آٹھ کر لیا تھا۔ وہ مجھ سے محنت کرنے اور کام پر توجہ دینے کے لئے اصرار کرتی تھی۔ نام بیویوں کی طرح کی وقت کا گلہ شکوہ نہیں کیا کرتی تھی۔

میرا لائف اسٹائل بدل گیا تھا۔ میں ایک کامیاب بیرم تھا۔ اسی حساب سے زندگی گزارنے کے اصول بھی بن گئے تھے۔ وقت بچانے کے لئے میں ہمیشہ جہاز میں سفر کیا کرتا تھا۔ اپنے ذاتی استعمال کے لئے میرے پاس نئے مازل کی کردلا تھی۔ کبھی اور بچوں کے لئے دوسری گاڑی خریدی تھی۔ میرے بچے بہترین اسکولوں میں زیر تعلیم تھے۔ گھر پر

انہیں پڑھانے کے لئے مجھے سے مہنگا نیوز رکھا جاتا تھا۔

کبھی بڑی طریقے سلینے والی مورت تھی۔ وہ خرچ بھی مکمل انداز میں کرتی تھی اور کلمات میں بھی ماہر تھی۔ اس کی وجہ سے میرا بینک بیلنس بھی خاصا متاثر کن تھا اور میرا گھر بھی بہترین انداز میں چل رہا تھا۔

ہاں! مگر ان تمام جھیلیوں سے گھبرا کر کبھی کبھی دل فرصت کے وہی رات دن کی تلاش کرتا تھا جو وقت کی چکا چندہ میں کہیں کھو گئے تھے۔



قریباً ڈھائی بجے کا عمل تھا جب میری گاڑی کی ہیڈ لائٹس نے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سیاہ گیت کو روشن کیا۔ گھرے سٹانے کو ہارن کی آواز نے چند لمحوں کے لئے چونکا دیا تھا۔

میں نے اپنا سر سیٹ کی پشت پر نکا دیا اور چہرے پر ہاتھ رکھ کر چند لمحوں کے لئے سٹانے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں چونکدار گیت کھول چکا تھا۔ ڈرائیور گاڑی اندر لے گیا۔ گاڑی سے اتر کر اپنا بریف کیس اٹھائے میں اندر آیا تو منورہ جاگتی ہوئی ملی۔ وہ ہنسی بخش وقتی ملازمہ تھی۔

”سلام صاحب جی!“ اس نے بریف کیس مجھ سے لے لیا۔

”والسلام۔“ میری آواز اور لہجہ جھکن سے چور تھے۔ ”تمہاری بیگم صاحبہ“

”سورہی ہیں صاحب جی..... کھانا لگاؤں؟“

”نہیں۔“ میں نے مختصر اکبرہ کر سیر حیدوں کا رخ کیا۔

کوٹ کا اندھے پر لٹکائے گولائی میں ادھر جاتی ہوئی سیر حیدیں چڑھتا میں آنے والے کل کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کل کا دن بھی انتہائی مصروفیت کا دن تھا۔ علی الصبح بیدار ہو کر مجھے ایک ضروری کیس اسٹڈی کرنا تھا۔ پھر بذریعہ پلین لاہور جانا تھا۔ وہاں میری ایک اہم میٹنگ میں شرکت از حد ضروری تھی۔ پھر شام کو واپس کراچی۔ بے حد تھکا دینے والا دن میرا منتظر تھا۔ مجھے کچھ چھیننا بہت سی ہوئی۔

صاف سٹرا کرا میرا منتظر تھا۔ چمکتا فرنیچر بے داغ بے شکن بندشیت سٹرا تالین

لیکن کیتی وہاں نہیں تھی۔ وہ اکثر میری غیر موجودگی میں بچوں کے کمرے میں ان کے ساتھ سو جایا کرتی تھی۔

مجھے نجانے کیوں غصہ آیا۔

"یہ کیتی روز ہی بچوں کے ساتھ سو جاتی ہے۔ اسے کبھی تو میرا انتظار کرنا چاہئے۔" پھر اگلے ہی لمحے مجھے کس کا دن یاد آ گیا۔ میرے پاس غصہ کرنے کے لئے وقت ہی کہاں تھا؟

لباس تبدیل کر کے میں چہرے پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔ ذہنی تناؤ کم کرنے کا اچھا طریقہ تھا۔

سراٹھا کر جب میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا تو مجھے یاد آیا۔

آج چودہ اکتوبر تھی۔ میری ساگرہ کا دن۔ آج میں پورے چالیس برس کا ہو گیا تھا۔ میں کچھ دیر خود کو دیکھتا رہا۔ اپنا سن پیدائش یاد کر کے میں نے پھر دل ہی دل میں حساب لگایا شاید کہیں سے ایک آدھ سال کی گنجائش لگے۔ سیدہ سادا سا حساب پھر سامنے آیا۔ پورے چالیس برس۔ نہ کم نہ زیادہ۔

تو لیے سے منہ پونچھتا میں باہر نکلا تو آنکھوں میں نیند بھرے کیتی میرے مقابل تھی۔

"ارے تم کیوں جاگ گئیں؟" میں مسکرا دیا۔

"میں نے سوچا کھانے کا پوچھ لوں!" اسے اب بھی سخت نیند آ رہی تھی۔

"میں کھانا کھا کر آیا ہوں۔ ویسے بھی منورہ جاگ رہی تھی تم نے بے وجہ ہی اپنی نیند خراب کی۔ اچھا یوں کر ذچہ بجے کا الارم لگا دو۔ مجھے علی الصبح اٹھنا ہے۔"

میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔

کیتی آرام نے ٹائم سیٹ کر کے الارم چیس میرے سر ہانے رکھ دیا۔ پھر ٹائٹ بلب روشن کر کے لائٹس آف کر دیں اور خود بھی اپنی بجلی لیٹ گئی۔

ہر چند کہ میں بہت تھکا ہوا تھا پھر بھی کیتی کی سانسوں کے زیر و بم سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھ سے پہلے ہی سو گئی تھی۔

مجھے بھر یاد آ گیا۔ آج تو ساگرہ کا دن یوں دبے پاؤں گزرا تھا کہ مجھے خود بھی خبر نہ ہوئی تھی۔ شادی کے بعد ابتدائی چند برسوں میں کیتی نے اس دن کا بڑا خیال رکھا تھا۔ میں گھر لوٹتا تو اسے خصوصیت سے تیار دیکھ کر کسی خاص بات کا احساس ہو جایا کرتا تھا۔ پھر وہ اہتمام سے تیار کردہ کیک اور دیگر لوازمات میز پر سجاتی تو میں فوراً سمجھ جاتا تھا کہ اسے میری ساگرہ کا دن یاد ہے۔ میں اسے رات کا کھانا باہر کھانے لے جاتا تھا اور ہم رات گئے خوش باش لوٹتے۔

یہ محض چند ابتدائی برسوں کی بات تھی بچے بڑے ہوتے گئے۔ کیتی اور میری مصروفیات بڑھتی گئیں۔ کیتی اچھی بیوی اور بہت ہی اچھی ماں تھی۔ اس نے زندگی بچوں کے لئے وقف کر دی تھی۔ ہر چند کہ گھر میں دیگر ملازم اور ایک کل وقتی ملازمہ موجود تھی لیکن میرے اور بچوں کے زیادہ تر کام وہ خود سرانجام دینا پسند کرتی تھی اور جب سے بچوں نے اسکول جانا شروع کیا تھا وہ زیادہ حساس ہو گئی تھی۔

دوسری جانب میں اپنی فیلڈ میں آگے اور آگے جانے کے لئے کوشاں تھا۔ مجھ پر اچانک ہی بہت زیادہ ماحصل کرنے کا بھوت سوار ہوا تھا۔ یہ جنون کسی منہ زور دریا کی مانند چڑھتا ہی چلا گیا۔

کیتی اور بچے جیسے کسی پس منظر کا حصہ بن گئے تھے۔ مجھے بس اتنا علم ہوتا تھا کہ صبح جب میں کورٹ جانے کی تیاری میں مصروف ہوتا تو کیتی بچوں کو اسکول بھیجنے کی ٹکر میں مبتلا ہوتی تھی اور رات گئے۔ جب میں اپنی اسٹڈی سے برآمد ہوتا تو بچے سو چکے ہوتے تھے اور اکثر یوں ہوتا کہ ان کو سلاتے سلاتے کیتی بھی ان کے ساتھ ہی سو جایا کرتی تھی۔ بچے نامہ ان رسم و رواج، تقریبات ہر طرح کی ذمہ داریاں کیتی نے بٹا کچھ کبے سے سنبھال لی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا کہ میں اپنے پیوی بچوں کو نظر انداز کر رہا ہوں تو میں خود ہی اسے مذمت پیش کرتا۔

"آؤں کے کچھ کر دکھانے کا بیجا پیر یڈ ہوتا ہے کیتی! جس مرد نے مر کے اس حصے میں محنت کر لی تب تو وہ ساری عمر اس کا پھل پائے گا۔ ایسے میں میری کوتاہیوں کو جھپٹیں نظر انداز کرنا ہی جوچا اور پھر میں یہ سب کچھ کس کے لئے کر رہا ہوں؟ تمہارے لئے بچوں

کے لئے۔ "گیتی سمجھدار عورت تھی۔ اس نے خود کو گھر اور بچوں میں مصروف کر لیا۔ زندگی کے خانوں میں ہم اس طرح سے بٹ گئے کہ یہ خانے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے بھی تھے اور علیحدہ علیحدہ بھی تھے۔

لیکن یہ کیا ہوا تھا کہ بے ٹکان منت کر رہا ہوا بختیار احمد اچانک ہی یوں چونکا تھا جیسے پوری رفتار سے بھاگتے ہوئے کسی شخص کے پاؤں میں کانٹا چبھ جانے کا احساس سوا ہو جائے۔

نجانے کیوں دل میں ایک کانٹا سا کھب گیا تھا! زندگی سے زندگی کی بے تماشیا مصروفیات سے فانی بوجھ اور سخت تناؤ کی کیفیت سے میں اچانک ہی اکتایا تھا۔

"حیرت ہے! گیتی کو اب میری سالگرہ بھی یاد نہیں رہی۔" سونے سے پیشتر میں نے خود سے کہا۔



"مینشن۔ تناؤ۔" باقر نے سگڑ ساگاتے ہوئے مجھے دیکھا۔

"کتنے برس کے ہو گئے ہو بختیار!؟" پھر دھواں فضا میں بکھیرتے ہوئے اس نے دلچسپی سے پوچھا تھا۔ میں نے گہری سانس بھر کر آرام دہ سیٹ کی پشت سے ٹیک لگالی۔

"پورے چالیس برس کا۔"

"ہا ہا ہا۔" اس نے ایک پر زور قہقہہ لگایا۔ "ساری خرابی ہی یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ بختیار احمد! مرد کی زندگی میں دو ہند سے بڑے خطرناک ہوتے ہیں۔ ایک چودہ کا اور ایک چالیس کا۔ چودہ برس کا ہندسہ ماؤں کے لئے خطرناک ہے اور چالیس کا ہندسہ بیوی کے لئے۔"

"دانت ربڑ! میں نے اسے دلچسپ نگاہوں سے گھورا۔ "مرد تو اول آخر خطرناک ہے باقرا!"

"نہ نہ چودہ برس کی عمر میں اگر ماں بیٹے کو سنبھال لے تو مرد خطرناک نہیں اور چالیس برس کو پہنچے تو بیوی کو اپنی سی کرنی چاہیے۔"

"کیوں چالیس برس کا مرد پاگل ہو جاتا ہے۔ کانٹے کو دوڑتا ہے؟" میں نے

تدر سے تسخیر سے پوچھا۔

"یو آر رائٹ!" اس نے میز بجا لی۔ "چالیس برس کا مرد بات بات پر بیوی بچوں کو کانٹے کے لئے دوڑتا ہے۔"

"ربڑ! ... یہ کچھ نہیں ہے۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ "آئی لو گیتی۔ آئی لومائی پلڈرن!"

"ہاں مگر تم ایک ہی رفتار سے ایک ہی ٹارگٹ کے پیچھے بھاگتے بھاگتے تھک جاتے ہو بختیار! دیکھو یہ جو پوزیشن کی دوڑ ہے اس کا اختتام نہیں ہے۔ اس کا اختتام تو بس قبر کے سامنے جا کر ہوتا ہے۔ مرد جب بھاگتے بھاگتے تھک جاتا ہے تو کچھ دیر کے لئے سستانے کے لئے رکنا چاہتا ہے اور جب اس کی کوشش میں رفتار کم ہوتی ہے تو وہ ہانپنے لگتا ہے ہانپنے کے اس عمل کو ہی مینشن کہتا ہوں۔ تیز رفتاری سے اپنی منزل کی جناب بھاگتے محض کونجھی یہ مینشن نہیں ہوتی۔ یہ تو ہمیشہ اس وقت ہوتی ہے جب دل رکنا چاہتا ہو اور قدم ہٹا کر رہے ہوں۔"

باقر کی گفتگو میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ میں کچھ بھی بولے بنا اسے سننا رہا۔

"تم کیرئیر بنانے کے چکر میں بھاگتے گئے۔ پھر تمہیں روپیہ کمانے کی لت پڑ گئی۔ تمہاری رفتار اس قدر تیز ہو گئی کہ بیوی بچے پیچھے رہ گئے۔ تمہارے منظران کے مناظر سے تبدیل ہو گئے۔ ان کی دنیا تمہاری دنیا سے الگ ہو گئی اور سستانے کے شوق میں جب تم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو تمہیں احساس ہوا اکیلے پن کا تہائی کا۔"

میں ایک لمحہ اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے میری آنکھوں سے شاید اپنے کہے کی درستی کا احساس ہوا۔ اس کے لب مسکرانے لگے۔

"کیا تمہیں نہیں لگتا بختیار کے گھر خاندان بچوں اور دیگر ذمہ داریوں میں الجھ کر تمہاری بیوی نظر انداز کر رہی ہے۔"

"نکلے گا ہے!" میرے لبوں سے بے ساختہ ہی نکلا تھا۔

"اور بچے! عمر کے اس دور میں عموماً ماں باپ کی نہیں۔ اس عمر میں آسائشات کی طلب ہوتی ہے۔ جو شخص یہ آسائشات فراہم کر رہا ہو اس کی اہمیت کا احساس نہیں ہوتا۔"

”یعنی کسی کو عملاً میری ضرورت نہیں۔“ میں پھینکی سی ہنسی ہنس کر سرگرمیٹ سلگانے لگا۔

”تمہیں ایک شے کی ضرورت ہے۔“ وہ پراسرار سے انداز میں مسکرایا۔
میں نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”چلو تمہیں کسی سے ملواتے ہیں۔ ٹینشن کم کریں۔ تمہاری۔“ وہ اچانک کھڑا ہو گیا۔

”میرے پاس محض دو دیکھنے ہیں باقرا“ میں نے قیمتی رست و اوج پر نظر دوڑائی۔
”میری فلائٹ کراچی کے لئے لیٹ ہو گئی تو میں تم سے ملنے چلا آیا۔“
”ارے چلے جتا۔“ وہ مسکاتا ہے آپ فلائٹ ہی چھوڑ دیں۔“ اس نے زوردار قہقہہ لگایا تھا۔

اس نے مجھے حیرت زدہ کر ڈالا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو چلا۔ اس کی سوک میں منزل تک پہنچنے میں ہمیں زیادہ وقت نہیں لگا۔ یہ ایک پلازہ تھا۔ ایک قدرے پرانی عمارت۔
بارش نے جسے اچھا ہونا نقصان پہنچایا تھا۔ باقر میز حیاں چڑھنے لگا تو میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ غالباً تیسری منزل کے ایک فلیٹ کے سامنے رکا تھا۔

کال بیل کے جواب میں ایک بوڑھے شخص نے دروازے سے سر نکالا تھا۔ باقر کو دیکھ کر اس کے لب مسکرائے۔ اس نے دروازہ داکر کے گویا ہمیں اندر آنے کی دعوت دی۔

”کہاں لائے ہو باقر مجھے؟“ مجھے ایک الجھن نے آن گھیرا۔

”دعائیں دو گے ہیر منتر صاحب!“ اسے میری الجھن کی مطلق فکر نہ تھی۔ وہ یوں

بی مسکراتا رہا۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ فلیٹ اندر سے نسبتاً کشادہ اور صاف ستھرا تھا۔ ڈرائنگ روم کی جھاوٹ میں بھی اچھے ذوق کی کارفرمائی نمایاں تھی۔ ایک حصے کو سفید لٹریوں کے پردے کی مدد سے علیحدہ کیا گیا تھا۔ میں ابھی لٹریوں کے موتیوں پر غور کر رہا تھا کہ یکایک لٹریاں ایک طرف ہو گئیں اور وہ اندر داخل ہوئی۔ میں گڑبڑا سا گیا۔
”آداب“ اس نے داخل ہوتے ہوئے بڑے طریقے سے کہا تھا۔

”کیسی ہوسا حارہ“ باقر مسکراتا تھا۔
”اچھی ہوں۔“ وہ بھی مسکرائی۔ گویا روشنی بکھر گئی۔ ”بڑے دن بعد کرم فرمائی

کی۔“

”ان سے ملو۔۔۔۔۔ یہ ہمارے بڑے پرانے یار ہیں۔ برسوں بعد ملے ہیں۔ ہیر منتر بختیار احمد! ہم نے سوچا کچھ دعا سلام ان کی آپ سے کروائی جائے۔“

”زہے نصیب۔“ وہ مسکرائی ”کیسے ہیں ہیر منتر صاحب! حراج اچھے ہیں؟“
”بختیار! یہ سارہ ہیں! صرف نام کی ہی نہیں شخصیت کی بھی! اسم با سکی ہیں

گویا۔“

میں نے سر ہلا کر تعارف کا مرحلہ مکمل کر لیا تھا۔ باقر کا یہ اقدام مجھے قطعاً اچھا نہ لگا تھا۔ مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ وہ مجھے کسی اس قسم کی عورت سے ملوانا چاہتا ہے۔ اب تک تو میں یہیں سمجھ رہا تھا کہ کسی بہت پرانے دوست سے یا کسی اہم شخصیت سے ملوانے لے جا رہا ہے۔
وہ تو کسی اور ہی خیال میں تھا۔

”میرا خیال ہے میں چلوں باقرا!“ مجھے دندہ کوفت نے آن گھیرا۔ ”میری

فلائٹ۔“

”ابھی دو دیکھنے دور ہے۔“ اس نے میرا جملہ اچکا۔

”بیٹھے! ہیر منتر صاحب!“ سارہ تاز سے بولی۔

”اب آپ مہمان ہیں ہمارے۔۔۔۔۔ اور اپنے مہمانوں کو ہم ایسے رخصت نہیں

کرتے۔“

”پلیز میں لیٹ ہو جاؤں گا۔“

”ہم آپ کے لئے فلائٹ لیٹ کر دے دیں گے۔“ وہ کلکسلا کر ہنس دی۔ ”یقین

جائیے۔“

”بابا۔۔۔۔۔ پھر اس نے آواز دی تھی۔

”جی بی بی جی۔“ وہی بوڑھا شخص نمودار ہوا۔

”اچھی سی کافی پلو ایسے۔۔۔ کچھ کھانے کے لئے بھی لائیں۔ لیکن ذرا جلدی۔“

بیرسٹر صاحب کی فائٹ ماس ہو گئی تو یہ سارا الزام ہمارے کھاتے میں ڈال دیں گے۔“
اس کے لب مسکرا رہے تھے۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔ شاید بکھیرا ہو گیا ہو۔
تھی۔ اس کے سارے فٹوش مثل کے لئے بھول جلیوں کا کام کرتے تھے۔
چمکتی سفید ہانگ سے نگاہ پھلتی پیشانی تک چلی آئی تھی۔ کمان دار ابرو متناطیس
چمک کی حامل آنکھوں تک کھینچے آتے تھے۔ ایک لمحہ کے لئے نظر ستواں تک میں پڑی
بیرے کی لوہک سے خیرہ ہوتی تو اگلے ہی بل سفید دانتوں کی جلوہ گری مثل کی نگاہ کو بچھ ڈالتی
تھی۔

”بیوٹی فل!“ میرے دل سے بے اختیار نکلا تھا۔

باقر کو میری دلچسپی کا اندازہ ہو چلا تھا۔ وہ بے نیازی سے اپنے برہسلیت سے
کھیل رہی تھی۔

تمہارا غزلوں کا ٹکیشن وہیں تک ہے یا اس میں کچھ اضافہ بھی ہوا ہے؟“ باقر اس
سے پوچھنے لگا۔

”کئی نئے کیسٹس لائی ہوں۔ چاہیں تو حسن ذوق کو محفوظ کیجئے۔“ اس نے سامنے
والے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

”میں ابھی آیا ہوں۔ اپنی پسند کی چند ایک غزلیں سن لوں۔“ باقر اٹھ کر اندر
کمرے میں چلا گیا۔

میرے اور اس کے بیچ تنہائی حاکم ہوئی تو مجھے اس کی متناطیسیت کا صحیح انداز
ہوا۔ وہ بڑی قیامت خیز جوانی کی حامل عورت تھی۔ نگاہ پڑتے ہی دل اس کی جانب کھینچنے لگا
تھا۔

”بڑا مختصر قیام ہے آپ کا ہمارے شہر میں۔“ وہ انداز دلنوازی سے بولی۔

”شہریوں کے متعلق میرا علم کمزور تھا۔“ میں سادگی سے بولا۔

اس نے دھیماسا قبضہ لگایا۔

”پھر اب کیا خیال ہے؟“

”سوچنا ہوگا۔“ میں اس کے سحر سے بچنے کی خاطر سرکٹ سٹائے لگا۔

”ضرور سوچئے! لیکن خیال رہے۔ بسا اوقات جتنے ہاتھ پیر زیادہ چلیں بندہ اتنی

ی تیزی سے ڈوبتا ہے۔“

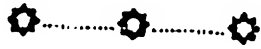
اسے اپنے متعلق کسی قسم کی غلط فہمی نہ تھی۔ میں مسکرا دیا۔

”ہاں۔۔۔ اگر انسان تیرا نہ جانتا ہو۔“ پھر میں بولا۔

”نہیں اگر تیرا کسی صورت میں آن پہنئے۔“

غضب کی برجستگی تھی میں نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی سمندر آنکھوں میں سمندر ہی

سمندر تھے۔



مجوزی تیزی سے تارکول کو سیاہ سرک پر بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ باقر مجھے ایئر

پورٹ تک چھوڑنے جا رہا تھا۔

ہمارے درمیان خاموشی کا ایک لمبا وقفہ آگیا تھا۔

”کچھ ٹاڈ نہیں ہے یا رہنمائی یہ۔“ پھر وہ بولا۔

شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کچھ خفا ہوں۔ حالانکہ ایسا برعکس تھا۔ میں ساحرہ کے

متعلق سوچ رہا تھا۔

”مرد کے لئے یہ ریلیکسیشن بہت ضروری ہے۔ گھر کی عورت اندازہ کری نہیں

سکتی کہ نئی زمانہ باہر کی دنیا میں اپنی بتا کی لڑائی لڑتا مرد کس ذہنی تناؤ سے دوچار رہتا ہے۔

جیسے ہی ہوئی رہی پر قدم قدم بڑھاتے جاؤ۔ ہر طرف ایک لڑائی ہو چو کھم لڑتے رہو۔ اسے

تو بس یہ علم ہوتا ہے کہ کئی یہ صوفہ یہاں سے اٹھا کر وہاں رکھ دو یہ میز اس کوئے میں رکھی ہے

تو نمیک سے اس کی قیمت کا اندازہ نہیں ہوتا مسز فلاں نے ڈریسٹ فلانی جگہ پر خریدنا ہے

بہت سست مل گیا۔ یہ بچہ پڑھائی میں سست ہے اسے ٹیوٹر کی ضرورت ہے دوسرے بچے کو

پرسل کمپیوٹر چاہئے۔ یا یہ باتیں تو جھنجھلاہٹ میں بتا کر دیتی ہیں۔ ذہنی تروتازگی کے لئے

ایک بچوں کی محبوبہ کی ضرورت ہے۔ رہنمائی! جو غزلوں پر گفتگو کرے چاندنی رات کے

تھے چھپرے ساحل سمندر پر ہاتھ میں ہاتھ دے کر دور تک جائے۔ بیوی کو تو یہ فکر آن

غیر ہے گی کہ بائے پیچھے پیچھے اکیلے رہ گئے ہیں کوئی ڈوب نہ جائے۔“



”کیا بات ہے؟ تم خاموش کیوں ہو گئیں؟“

نہایت بے چینی سے آپ کی فکر تھی۔ میں حقیقتاً آپ سے

میں حقیقتاً ساحرہ کے ساتھ لائیک ڈرائیو پہ نکل گیا۔ کراچی سے لاہور اور لاہور سے کراچی کا سفر میرا معمول بن گیا۔ کبھی کو میرے اندر رونما ہونے والی تبدیلیوں کا احساس ہوا تھا یا نہیں! میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ ایک پرسکون سمندر کی مانند تھی مجھے اس کے اندر موجزن جذبوں کا ظلم اکثر نہیں ہوتا تھا۔ یوں بھی کہتی میرے لئے سانس لینے کے عمل کا نام تھی۔ از حد ضروری اور نہایت غیر محسوس ساحرہ میری فیڈ بیک بن گئی۔ ممکن جسم و جاں کو چڑھتی تو مجھے ساحرہ کی کمی محسوس ہونے لگتی۔ میں لاہور پہنچ جاتا اور نہایت فریض ہو کر واپس لوٹتا۔ واپس آ کر کہتی مجھے اچھی لگتی۔ بچوں کے ساتھ کچھ وقت گزارنا دلچسپ محسوس ہوتا۔ باقر کے بتائے ہوئے فارمولے نے زندگی کو واقعی خوشگوار بنا دیا تھا۔



دس سال پورے دس سال ساحرہ کے بحر میں مبتلا ہو کر یوں گزرے کہ مجھے میرے سر بختیار احمد کو مزکر سودوزیاں کے حساب کتاب کا ایک مرتبہ بھی خیال نہ آیا۔ ساحرہ نے حقیقتاً مجھے بہت محبت دی۔ اس نے مجھے روح تک شانت کر دیا۔ میں نے اسے روپیہ دیا۔ اپنا قیمتی وقت دیا۔ ہمارا حساب برابر چل رہا تھا جب اس نے مجھ سے بہت بڑی فرمائش کر دی۔

”بختیار! ... مجھ سے شادی کر لیں۔“

”رات نان سنس ساحرہ!“ میں اس کی فرمائش پر بے ساختہ ہنس دیا۔ ”یہ تمہارے اور میرے بیچ شادی جیسا فارمولا موضوع کس لئے۔“

”بختیار! میں بنیدہ ہوں۔“ وہ واقعتاً سنجیدہ تھی۔ ”مجھے اعتراف ہے کہ آپ سے پہلے میری زندگی میں کئی مرد آئے۔ آئے اور چلے گئے۔ سمندر کی لہروں کی طرح۔ اپنا ہر نقش خود ہی مٹا گئے۔ آپ مجھے سب سے بہت کر گئے۔ سب سے مختلف میں نے اپنا دل جسم اور سوچیں سب کچھ آپ کو دان کر دیا۔ میں اپنی روح کی سچائی سے آپ کی بن گئی۔ جی جی جی میں آپ کی پوجا کی ہے میں نے لیکن لیکن اب من کرتا ہے بختیار! کہ آپ دیوتا نہیں انسان بن کر یوں ملیں کہ من و تو کا فرق مٹ جائے اور یہ خصوصیت محض ایک ہی رشتے کو حاصل ہے۔“

”محبت کا رشتہ ہر شے سے زیادہ معتبر ہے ساحرہ! بیگم! میں ذرا سادہ ہوں۔“ اس میں کسی کاغذی کی ضرورت نہیں اور نہ میں نے تم سے کبھی نہیں کہا میں کبھی تم سے شادی بھی کر رہا ہوں۔“

”مجھے اعتراف ہے بختیار!“ اس کی نظریں جھک گئیں۔ ”لیکن آپ کو بھی تسلیم کرنا ہو گا میں ایک طوائف ہو کر بھی کبھی آپ سے طوائف بن کر نہیں ملی۔ آپ کے لئے طوائف سے بھر مورت بن گئی۔ اب میں عورت سے بیوی بننا چاہتی ہوں۔ کیا میری دس سال کی ریاضت کا اتنا سا صلہ بھی آپ کے پاس نہیں۔ محض نکاح کے تین بول؟“

”کیا ان دس سالوں میں میں نے تمہیں کچھ نہیں دیا ساحرہ؟“

”دوسب کچھ جس کی مجھے تمنا نہ تھی۔“ وہ گہرے دیکھ سے بولی۔ ”دولت بھندہ گاڑی۔۔۔ ان سب چیزوں کی تمنا آپ سے مل کر ختم ہو گئی تھی۔“

”رہش ختم کرو!“ میں ہنسیا کر کھڑا ہو گیا۔

”بختیار!“ وہ تیزی سے میرے سامنے آ گئی۔ ”میں آئندہ محض بیدی کی حیثیت سے آپ سے ملنا چاہوں گی۔“

”میں سوچوں گا۔“

میں کہہ کر وہاں رکا نہیں۔ تیزی سے نکل آیا۔



میں گھر میں داخل ہوا تو سفیان نہیں جا رہا تھا۔

”السلام و شیکم پاپا۔ باؤ آر یو۔“ وہ اپنی ”سنی“ کی چابی جھلاتا خاص تیزی

میں تھا۔

”ہیکم السلام۔ کہاں جا رہے ہو پر خوردار!“

میں کوئی نکتہ بھر بعد اس کی شکل دیکھ رہا تھا۔ اس کا یوں تیزی سے جانا مجھے پسند

نہ آیا۔

”پاپا۔۔۔“ وہ زار زار کی آواز کا ”ایک دوست سے مانا ہے۔ میں ویسے بھی لیٹ

ہو گئی ہوں۔“

”او کے گوا“ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اندر چلا آیا۔
 اندر مارا اور ایمان کی سہلیاں آئی ہوئی تھیں۔ غالباً کوئی دن ڈس ٹائپ تقریب
 تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں ذرا سا جمنا کر اوپر کمرے میں چلا آیا۔
 منورہ میرے پیچھے آئی تھی۔

”صاحب بی! کھانا لاؤں؟“

”ہوں؟“ میں کئی خیال میں چونکا۔ ”کیسی کہاں ہے؟“

”جی جی شاید مارکیٹ گئیں ہیں۔ کچھ بتا کر نہیں گئیں۔“

”میں ان کے ساتھ ہی ڈنر کروں گا۔“

”جی بہتر!“ وہ چلی گئی۔

میں نوکس تبدیل کر کے بیڈ پر چلا آیا۔ نیکے کے سہارے نیم دراز ہو کر میں برنس
 سے متعلق میگزینز دیکھنے لگا۔

میرے ذہن میں ساحرہ کی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ ذہنی طور پر میں غیر حاضر تھا۔
 کتنی عجیب سی فرمائش کی تھی اس نے! میں یہ سزا بخیر احمد جو اتنے سالوں کی محنت
 کے بعد اب اس کا پھل پانے والا تھا اس مقام پر آ کر دوسری شادی کرتا اور اب بھی ایک
 طوائف زادی سے؟ اور پھر مجھے بیوی کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ کیسی جیسی بیوی کے ہوتے
 ہوئے کوئی پہل ہی دوسری شادی کے متعلق سوچ سکتا تھا۔ میرا گھر تھا بیوی تھی چار بچے
 تھے۔ جو جوانی کا حدود میں داخل ہو رہے تھے۔ میں دوسری شادی کیوں کرتا؟

مجھے ساحرہ کی باتوں اور اس کے تصور سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ میں نے محسوس کیا
 کہ زندگی کا یہ باب اب بند ہوتا چاہیے۔

چند ہی لمحوں میں میں اس کا ظہر ڈاکل کر رہا تھا۔ نیلو ساحرہ! بختیار بات کر رہا
 ہوں۔“

”تسے اس کا لہجہ کڑور تھا۔“

”میں نے بعد یہ ہے۔ میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ مجھے شادی کی ضرورت

ہی نہیں ہے۔“

”بختیار“ اس کی آواز دھک سے بوجھل ہو گئی۔ ”میں نے محض ایک کائنات ہی مانا

تھا۔“

”میں وہ کائنات نہیں نہیں دے سکتا ساحرہ۔“ میرا لہجہ جتنی تھا۔ ”میں نے تمہیں اپنی
 زندگی کے دس سال دیے ہیں۔ بے حساب پیسہ دیا ہے۔ اپنی جیون ساتھی کا اثہ اور اعتبار
 دیا ہے۔ تمہیں آج تمہیں شادی کی خواہش ہے کل کو تم بچہ مانگو گئی پھر تمہیں اس کے
 حقوق کا خیال ستائے گا تمہا کی کوئی حد نہیں ہوتی ساحرہ میں بہر حال اپنی زندگی سے
 مطمئن ہوں۔ میری بیوی بہترین ہے میرے وارث جو ان ہو چکے ہیں۔ اور میرا خیال
 ہے میں تمہیں تمہارے حصے کا وقت دے چکا ہوں۔ تم آئندہ مجھ سے محض بیوی کی حیثیت
 سے ملنا چاہتی تھیں۔ میرا خیال ہے ہم آئندہ کبھی نہیں ملیں گے۔“

میں نے دوسری جانب اس کی سسکیاں سنیں۔

”خدا اے خدا!“

میں ریسور رتھ نر مڑا اور پتھر کا بن گیا۔ کیسی میرے سین مقابل تھی۔

”کیسی“ میرے لبوں سے اعتراف گناہ کی مانند نکلا تھا۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ اس کے چہرے پر بلا کی تجلی تھی۔

”آ کر کھانا کھا لیجئے!“ وہ کہہ کر مڑ گئی تھی۔



ایک طویل دھبے سے بعد مجھے احساس ہوا کہ اس روز تینتی کو دیکھ کر پتھر کا میں نہیں

ہوتا تھا۔ وہ سب باتیں اپنے کانوں سے سن لینے کے بعد تینتی پتھر کی ہو گئی تھی۔

میں اسی دن کے قانون ”ان ایڑی چوٹی کا زور اگا کر بھی اس پتھر کے مجھے میں

پتھر کبھی رون نہ چھوٹے گا۔“

اس نے مجھ سے کوئی استفسار نہ کیا تھا۔ مکمل شک سے کرنا اس کو کبھی نہ آیا تھا۔ بڑائی

بخشہ اس کی فطرت نہ تھا۔ ایسے میں نہ میں اس کا پتھر بن جاتا لازمی امر تھا۔

زندگی گزارتی چلی گئی۔ مجھے پھر کبھی کبھی بیوی کے روپ میں نہ ملی۔ وہ صرف

یہ ہے بچوں کی ماں تھی۔ یہ ہے گھر کی مالک تھی۔ وہ میری تینتی نہ تھی۔

سفیان اپنی تعلیم کے لئے باہر چلا گیا۔ فرقان دوسرے شیر باہل شفت ہو گیا۔
ارما اور ایمان کی شادی ہم نے ایک ساتھ ہی طے کر دی تھی۔ یوں بھی ہمیں بہتر
لگا تھا کہ دونوں بہنیں ایک ہی گھر میں چلی جائیں۔ زندگی بھر ایک دوسرے کی مونس و غم خوار
رہیں۔ ہماری بیٹیاں بیاہ کر چلی گئیں۔ گھر خالی ہو گیا۔ دل خالی ہو گیا۔

گیتی کے جذبات کیا تھے۔ مجھے علم نہ تھا۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کرنے کو
اب زندگی میں کچھ باقی نہیں۔

خالی دل خالی کمرے اور خالی گھر نے مجھے کسی ناگ کی مانند مساتحا میں دیوانوں
کی طرح گیتی کو ڈھونڈتا پھرنے لگا۔

ایک کمرے سے دوسرا کمرہ نیرس سیز حیاں، کچن، لائونج، ڈرائنگ ڈائننگ۔
سب جگہ ڈھونڈا وہ کہیں نہ تھی۔

پھر میں باہر نکل آیا۔ سفید لباس میں لمبوں افسردہ گیتی لان کی سیز حیاں پر بیٹھی
تھی۔ اس کی مانند اس زرد چاند سرد کے اوپر نکلا ہوا تھا۔ میں ایک ایک سیز صحرایہ اترتا اس کے
پاس جا بیٹھا۔

”گیتی۔ یوں اکیلی بیٹھی ہو؟“

اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

”میں ایک طویل غم سے اکیلی ہوں میرا صاحب“ پھر وہ موسم کی مانند
سرد اور خشک لہجے میں بولی۔ ”یہ آپ کو آج کیسے خیال آیا؟“

”کیا عورت کی الفت میں معافی کا لفظ نہیں ہوتا گیتی آرا؟“ میرے لبوں پر شکوہ سسک
پڑا۔

وہ دھیرے سے ہنسی دی۔

”مرد کی الفت میں ’’وفا‘‘ کا لفظ ہوتا ہے؟“

”میں نے کبھی تم سے بے وفائی تو نہیں کی تھی! جہیں تمہارے مقام سے کبھی
نیچے نہیں کیا۔ کسی دوسری عورت کو تمہارا مقام نہیں دیا۔ میں نے تو... تمہارا وقت ڈھونڈا
تھا اپنے لئے تم بہت مصروف تھیں۔ بیوی کو اپنے اندر نہیں سلا کر تم محض ماں بن گئی

تھیں۔ قصور وار صرف میں ہی نہیں ہوں گیتی! تم نے خود اپنے اور میرے بیچ اتنی ذمہ
داریوں کو جانت کر لیا کہ تم مجھے ایک خواب کی مانند کھنٹے گئیں اور بس ذرا سی دیر کو
میری آنکھ لگ گئی تم ماں بن کر توبہ کو بھول گئیں... تم نے فراموش کر دیا گیتی کہ مرد وہ بچہ
ہوتا ہے جسے روز ایک نیا کھلو دے کر بھانا پڑتا ہے۔ ورنہ یہ بچہ روٹھ کر گلی میں جا کھڑا
ہوتا ہے اور جو روزانہ کھلاں جائے وہیں جا ٹپتا ہے۔ بس اتنی ہی غلطی ہے گیتی...! حالانکہ
مذکر واپس اپنے گھر ہی آنا ہوتا ہے۔ گھر کا دروازہ کھلا ہونا چاہئے نا؟“
وہ خاموش بیٹھی چاند کو دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔

”بختیار! عورت کی خواہشات مرد سے مختلف نہیں ہوتیں۔ مرد توجہ چاہتا ہے برہنہ
محبت مانگتا ہے، مکمل نگرانی کرتا چاہتا ہے۔ عورت کو بھی توجہ درکار ہوتی ہے... بلبل اپنے
شوہر کی محبت اس کا دل بھی مانگتا ہے... لیکن یوں ہے بختیار کہ اس کے ضمیر میں خدا نے
قربانی کا وہ عظیم جذبہ بھی گوندھ دیا ہے جو مرد کے ضمیر میں نہیں۔ یہ مست کا جذبہ ہے ابتداء
سے انتہا تک صرف قربانی۔ اپنے سکھ کی قربانی، اپنی نیند کی قربانی، اپنے جذبات کی
خواہشات کی قربانی۔

قربانی کا یہ تصور مرد کے پاس نہیں ہے۔

بختیار! شوہر بیوی کے طاق نسیاں میں رکھا کوئی ان جہاں چراغ تو نہیں جسے ماں
بن کر بھول جائے۔ شوہر تو عورت کا وہ قیمتی زیور ہے جسے وہ حفاظت سے لا کر میں رکھ
بھی دے تو بھولتی نہیں۔ ہر روز صبح و شام اٹھتے بیٹھتے اسے اپنے زاوراؤ ستار حیات کا خیال
رہتا ہے۔ تحفظ کے اس عظیم احساس کو کوئی عورت کیسے فراموش کر سکتی ہے؟
اپنی اولاد کی پرورش کی خاطر اگر عورت اپنے جیون ساتھی کو مکمل توجہ نہ دے پائے
تو کیا اس کے لئے جیون ساتھی کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے؟

میرے بچے۔ نیا تمہارے بچے نہ تھے؟ ان کی خاطر جدوجہد کے لئے کیا تم مجھ
سے دور نہیں ہوئے؟ کیا میں نے تمہاری بے توجہی محسوس کر کے کسی ساحرہ کی کی کو محسوس کیا؟
کیا مجھے تمہاری محبت، تمہاری توجہ، تمہارے جذبات اور ان کے اقرار کی ضرورت محسوس نہیں
ہوتی تھی؟ بار بار بیوی تمہیں بختیار! بار بار لیکن میں نے زندگی میں کبھی کسی چور رستے کی

ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ میں ایک ماں تھی ماں! مستاکا سچا نشہ عورت کو اتنا بے نیاز رکھتا ہے اسے خود فراموشی کے جمبو نے سہاروں کی ضرورت نہیں پڑتی۔

لیکن شاید شاید بختیار ایک باپ کی محبت میں وہ طاقت نہیں جو ایک مرد کو بے نیازی، خود فراموشی سکھائے۔

مرد کبھی خود کو فراموش نہیں کر پاتا کبھی نہیں اس کے اندر چھپا انا کا ناگ بار بار اپنا بچن پھیلا کر کھڑا ہو جاتا ہے کہ ہاں میں ہوں! .. میں ہوں! میں ہوں! اور پھر مستاکا میں ڈوبی عورت کو چھوڑ کر مرد بھاگتے ہیں کسی ساحرہ کے پاس کسی حسن آرا کے پاس کسی مہ پارہ کے پاس۔

بھاگتے جاتے ہیں اور پلٹ پلٹ کر اپنا دروازہ دیکھتے جاتے ہیں۔
 ”لیکن بختیار! ایک بات غور سے سنو گھر کا دروازہ مرد کو ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ لیکن دل کا دروازہ ایک بار بند ہو جائے تو پھر کبھی نہیں کھلتا۔ کبھی نہیں۔“
 اس کی آواز آنسوؤں کی نمی سے رندہ گئی۔

”میرے دل کا دروازہ بھی عرصہ دو بند ہو چکا ہے۔ گھر آنا بھی تمہارا ہے بختیار! بچے تمہارے ہیں شاید یہ وجود بھی تمہارا ہے۔ بس ایک دل کی کمی ہو گئی ہے ایک دل کی۔“

وہ انہی اور تھکے تھکے قدموں سے اندر چلی گئی۔

”دل ہی تو چاہئے کبھی دل ہی تو چاہئے۔ مرد کی حقیقت کو اتنا سمجھتی ہو پھر بھی یہ نہ جان پائیں کہ عمر کی آخری منزل پر آ کر مرد کو ایک بار پھر صرف اپنی عورت کا دل درکار ہوتا ہے۔ اسے گھر کا نہیں دل کا دروازہ کھلا چاہئے ہوتا ہے۔“

میں زندگی کا سب سے اہم مقدمہ جلا کر دونوں باتوں سے سر تھامے رو رہا تھا۔



رہا تھا۔ موتیا کی منہ بندگی۔ میاں کو جگانے کمرے میں تھمی تو سامنے ہی سنگھار میز کے آئینے نے میرا استقبال کیا اور منہ چڑا کر ہنسنے لگا۔ میں میاں کو جگانے کے بجائے آئینے کے نزدیک چلی آئی۔ بال یوں بور ہے تھے جیسے ابھی ابھی بہت سی چڑیاں آپس میں لڑکر ان میں سے نکل بھاگی ہوں۔ کم خوابی نے پچھلے دن کی تکان کو اب تک چہرے پر سجایا ہوا تھا۔ تھکی تھکی پڑبردو آنکھیں کھلایا مرجھایا چہرہ دو دن سے پہنا ہوا لباس اب اتنا کندہ معلوم ہو رہا تھا کہ مجھے خود سے شرمندگی ہونے لگی۔

میں لاشعوری طور پر کتنھا اٹھا کر بالوں میں پھیرنے لگی۔ میاں نے کروٹ لے کر پہلے گھڑی کو اور پھر مجھے گھورا۔

”دس منٹ پہلے اٹھنا تھا۔ اور تم مجھے جگانے کی بجائے گھڑی سنگھار کر رہی ہو۔“ وہ سختی سے کہتے ہوئے تولیہ اٹھا کر ہاتھ روم کی جانب چلے گئے۔

بلو اٹھ کر رونے لگا۔ میں نے اسے دودھ لاکر دیا اور صابن اور اسد کو جگا کر تیار ہونے کو کہا اور خود تاشہ بنانے باورچی خانے میں چلی آئی۔

میرا دھیان بسہ میں اٹکا ہوا تھا۔ میں نے سلاٹس توے پر سے ادھ جلی حالت میں اتارے چائے آدھی چوبیسے میں گرائی، آدھی کیتلی میں ڈالی۔ اندوں کی زردیاں فرانگ پین میں گرتے ہی نوٹ گئیں حالانکہ میاں کو نوٹی ہوئی زردی دیکھتے ہی اندے اور مجھ سے نفرت محسوس ہونے لگتی تھی۔

اس روز میں نے دو تین مرتبہ میاں سے جھڑکھائی اور دو تین مرتبہ جھاز کر بچوں کو اسکول روانہ کیا۔ بلو کو تھپڑ مار کر دوبارہ سلایا اور گھر کے کاموں میں لگ گئی لیکن میرے دھیان کی سوئی بسہ کی ریکارڈ پر ہی اٹکی رہی۔ میں پنہ جیسے تیسے کام نہٹایا پھر ہاجرہ کے پاس چلی آئی۔ ہاجرہ میری پڑوسن تھی اور اس کے اور ہمارے گھر کی ایک دیوار مشترک تھی۔

ہاجرہ کو دیکھ کر مجھے یک گونہ سکون حاصل ہوا۔ وہ بھی میرے جیسے بدرنگ کپڑے پہنے بالوں کا ایک ٹکوتا سا جڑا بنائے برآمدے میں بیٹھی سبزی بناری تھی۔ سلام دعا کر کے میں بھی اس کے برابر بیٹھ کر پانک کے پھنسل توڑنے لگی۔ بلو اس کے چھوٹے منہ کے پاس بہہ بیٹھ گیا۔

”ہاجرہ! یہ دینو کا کا کے گھر میں کون آیا ہے؟“ میں نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔“ اسے میری توقع کے مطابق آگاہی تھی۔ ”آدی کسی سرکاری محکمے میں کلرک ہے۔ میر تو جانتے ہیں اسے کہہ رہے تھے بڑا اچھا لڑکا ہے۔“

”لڑکی کو دیکھا ہے تم نے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں! ارے بڑی چاندی لڑکی ہے، بسہ نام ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ میں نے سر بلایا اور پر خیال لہجے میں نام دہرایا۔

”میں تو پرسوں ہی مل آئی تھی۔ بڑے اخلاق والی ہے۔ تم نے نہیں دیکھا اسے؟“

اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

”آج دیکھا ہے۔“ میرے اندر حسرتیں بیدار ہونے لگیں۔

”مل آتا تھا نا۔ نئے پڑوسی ہیں۔“

”ابھی جاتی ہوں۔“ میں چپکے سے بولی۔

لیکن ہاجرہ کے گھر سے نکل کر بسہ کے گھر میں گھسنے کی میری ہمت نہ ہوئی۔ میں میڈمی اپنے گھر چلی آئی۔ اس کا وہ اجلا اجلا سا روپ اور میرا حلیہ ایسا جیسے گرم پانی میں اٹنے سے کسی کپڑے کا سارا رنگ نکل گیا ہو۔ تھکا ہوا پڑبردو بے رنگ وجود۔

شام کو سب کاموں سے فراغت پا کر میں خوب نہائی۔ پھر اپنا ایک قدرے نیا جوڑا پہن کر ہانکا پھانکا سائیکل اپ کر کے میں نے میاں کو پڑوس جانے کا بتایا اور بلو کو لے کر بسہ کے گھر چلی آئی۔ دروازہ اس کے شوہر نے کھولا تھا وہ ایک خوش شکل قدرے بے فکر سانو جوان تھا۔ ہاتھ میں ایک میلا سا تولیہ تھا۔ غالباً وہ اپنی مونر سائیکل کی صفائی میں مصروف تھا۔ مجھے سلام کر کے اس نے بسہ کو آواز لگائی۔

”بسہ! دینیہ کوئی باجی آئی ہیں۔“ وہ اندر سے نکل کر آئی۔ اس نے کپڑے بدل لیے تھے۔ شاید میری طرح وہ بھی نہا کر نکلی تھی۔ اب اس نے پھولدار سیاہ لباس پہنا ہوا تھا۔ چار جٹ کا سیاہ دوپٹہ گلے میں ڈالا ہوا تھا۔ کانوں میں تازہ پھولوں کے بالے تھے۔

میں تھوڑی دیر کے لئے اسے دیکھتی رہ گئی۔ مجھ سے کچھ بولا نہ گیا۔ وہ اتنی پر کشش اس قدر خوب صورت لگ رہی تھی کہ میں مگن ہو گئی۔

”السلام! کچھ باجی!“ اس نے آگے بڑھ کر بڑے اشتیاق سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"ولیکم السلام میرا نام زبرد ہے۔" میں کچھ بولنے کے قابل ہوئی۔

"جی میں جانتی ہوں۔ آپ سامنے تو رہتی ہیں۔ باجرہ باقی نے آپ کا بتایا تھا مجھے۔ آئیں نا بچی اندر آ جائیں۔"

وہ مجھے لے کر اندر کمرے میں چلی آئی۔ بنو اس کے شوہر کے پاس بیٹھ کر سوز سائیکس کی صفائی ہوتے دیکھنے لگا۔

"بیٹیس باجی!" وہ صوفے کی جانب اشارہ کر کے خود نواری پلنگ پر بیٹھ گئی۔ میں بیٹھ کر کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ہمارا گھر جس لین میں تھا اس میں سارے گھر تین کمروں والے تھے لیکن دینو کا کمرے کے کوارٹر کی لین کے سارے گھر محض ایک کمرے ایک چھوٹے برآمدے اور صحن پر مشتمل تھے۔ مگر میں دل ہی دل میں یہ اعتراف کئے بنانہ رہ سکی کہ بسمہ نے اپنے چھوٹے سے گھر کو بڑے سلیقے سے سجایا تھا۔

کمرے میں نواری پلنگ اور صوفہ پڑا تھا۔ ایک چھوٹی سی میز پر رکھے گھدپن میں تازہ پھول سجے تھے جن کی مہک سے سرہنجرہ دوا تھا اور ماحول میں عجب دل فریبی سی رہی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر بسمہ اور اس کے میاں کی تصویر لگی تھی۔ کمزکیوں پر بڑے اچھے پردے لگے ہوئے تھے جن کے رنگ دیوار کے رنگ سے بڑا بھلا امتزاج پیدا کر رہے تھے۔ پردوں کے خوب صورت ڈیزائن کی وجہ سے وہ کمرہ بڑا بڑا اور کشادہ محسوس ہوتا تھا۔ بستر پر بالکل صاف ستھری 'بے داغ' اچلی چادر بچھی ہوئی تھی۔ میں جس صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی وہاں سے باہر برآمدے میں رکھا شوکیس صاف نظر آ رہا تھا۔ اس میں بسمہ نے اپنے برتن سلیقے سے لگائے ہوئے تھے۔

"باجی چائے لیں گی یا ٹھنڈا منگواؤں؟" اس کی کھلتی آواز نے میرا دھیان اپنی جانب کیا۔

"نہیں، نہیں کوئی تکلف نہیں۔۔۔ میں تو بس تم سے ملنے آئی تھی اور سچ پوچھو تو تمہیں قریب سے دیکھنے آئی تھی کہ کیسی لگتی ہو۔ صبح تمہیں دور سے دیکھا تھا نا میرا دھیان سارا دن تم میں انکار رہا۔ اتنی اچھی لگ رہی تھیں کہ میں تم سے ملنے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ لیکن بسمہ! قریب سے تم اور بھی پیاری لگتی ہو۔" میں دل قبول کر اعتراف کئے بنانہ رہ سکی

تھی۔ بسمہ میری باتوں کے جواب میں کچھ نہ بولی۔ بس سر جھکا کر مسکرا دی تھی۔ "کتنا عرصہ ہو گیا ہے تمہاری شادی کو؟" میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"چھ مہینے!" وہ زیر لب مسکرائی۔

"اچھا" میں ہنس دی۔ "تمہیں دیکھ کر ایسا لگتا ہے۔ بسمہ! جیسے ابھی کل پرسوں تمہاری شادی ہوئی ہو۔"

بسمہ بھی شرمیلی ہنسی ہنس دی۔

"اسل میں باجی! یہ... ہیں نا! انہیں میرا ج سنو کر رہنا بہت اچھا لگتا ہے۔" وہ مجھے بتانے لگی۔

"یہ کہتے ہیں صبح میرے اٹھنے سے پہلے ہی کپڑے بدل کر تیار ہو جایا کرو۔ میں سو کر انھوں تو تم بالکل سچی بنی نظر آؤ اور شام کو میں کمر لوٹوں تو صبح سے زیادہ تیار ملو۔ انہیں میرا گندہ انداز بننا بالکل پسند نہیں۔ اتنا فتنہ کرتے ہیں باجی کہ میں ڈر جاتی ہوں۔ اس لئے صبح اٹھتے ہی پہلے نہلاتی ہوں تیار ہوتی ہوں پھر نماز پڑھ کر انہیں جگاتی ہوں اور شام کو بھی ان کے آنے سے پہلے ہی لباس تبدیل کر لیتی ہوں۔ یہ کہتے ہیں ہر وقت کلاسیاں چوڑیوں سے بھری رہیں۔ روزانہ عجب سے اور مگدستہ لے کر آتے ہیں۔ پھول انہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ کبھی کلاسیوں کے شجرے لاتے ہیں کبھی بالوں کے لئے کبھی کانوں میں پہننے کو۔۔۔ پھولوں سے بڑی محبت ہے جی انہیں۔"

"تم خود بھی تو ایک پھول ہو بسمہ!" میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ "نرم و نازک شائستہ تر و تازہ!" اپنی تعریف سن کر اس کے گال سرخ ہو گئے۔ اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

درحقیقت مجھے پہلی ہی نظر میں اس پھولوں جیسی لڑکی سے محبت ہو گئی تھی۔ اور اس سے ملنے کے بعد میں اور بھی اس کی گردیدہ ہو گئی۔ اس کی سادگی اور فطری معصومیت نے مجھے اپنا امیر کر لیا تھا۔ وہ ایک ایسی کہانی کی مانند تھی جس پر نگاہ پڑتے ہی ہر عورت اپنی زندگی کی کتاب کے ان اوراق کو پھر پلٹنے پر مجبور ہو جائے جہاں رنگوں، تیلیوں، جگنوؤں، خوشبوؤں اور پھولوں کی باتیں درج ہوتی ہیں۔ دو چاند اوراق جو پھر آگے آنے والی ذمہ داریوں کے بعد وہی ادا ب تلے ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتے ہیں۔ پھر کبھی نہ کھلنے کے لئے۔

اس سے میں نے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میں نے کسی اکاں پر برسوں بعد اس

پرفیوم کی مہک سونگھی ہو جو میں اپنے اوائل شباب میں استعمال کرتی تھی اور اس مہک نے مجھے کئی برس پیچھے پہنچا دیا ہو۔ وہ مہک جو چند لمحوں کے لئے عیسیٰ آپ کے دل کو اس انداز میں دھڑکا دیتی ہے جیسے وہ برسوں پہلے دھڑکتا تھا۔

بسمہ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ میں ہر دوسرے دن ان کے گھر آنے جانے لگی۔ وہ بھی میری بہت عزت کرتی تھی۔ اس کا شوہر رشید بھی بھلا مانس تھا، میرا بڑا خیال کرتا تھا۔ میرے جاتے ہی کبھی بھاگم بھاگم گرم گرم سوسے اور کچوریاں لے آتا، کبھی ٹھنڈی بوتلیں لاتا اور کبھی تازہ تازہ جلیبیاں۔ ہمارے محلے میں ان کے آنے سے بڑی رونق ہو گئی تھی ورنہ تو وہی چند ایک چہرے تھے جنہیں دیکھ دیکھ کر آنکھیں دکھ گئی تھیں اور وہی بد مزہ دل جلی باتیں تھیں جن سے دل اکتائے ہوئے تھے۔

محلے بھر کی زندگی سے بیزار روٹین لائف سے تنگی پڑ مردہ عورتوں کے لئے بسمہ جیسے گرم گرم چائے کا کپ ثابت ہوئی تھی۔ سب میں تازگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے سب کو جوانی کے اولین دور کی یاد دلادی تھی۔ بسمہ ہمارے محلے کے لئے جیسے صفائی کی نئی مہم کا نام تھا۔ وہی خواتین جو نینتے بھر پہلے پہنے ہوئے کپڑوں میں لمبوس بلا تکلف سب کی مزاج پر ہی گرتی پھرتی تھیں اب گھر سے باہر جھانکنے سے پہلے ایک بار آئینہ پر ضرور نگاہ دوڑا لیا کرتی تھیں۔

میں کبھی باجرہ کو آواز لگا کر کوئی چیز مانگا کرتی تھی تو وہ فوراً ہی چیز دینے کے بہانے میرے گھر آن دھکتی تھی اور کبھی بھی اپنے حلیے کی پروا نہ کرتی تھی۔ خواہ اس کے سر میں مہندی تھی، ہوئی یا کپڑے دھونے کے دوران شلوار ٹخنوں سے اونچی اڑی ہوئی۔ لیکن اب میرے کچھ مانگنے پر باجرہ وہ چیز بچوں کے ہاتھ بھجوا دیتی تھی اور ساتھ پیغام بھی۔

”ای کہہ رہی ہیں انہوں نے بالوں میں تیل ڈالا ہوا ہے وہ نہا کر آئیں گی۔“

خود میرا اپنا بھی یہی عالم تھا۔ میں بی اسے پاس تھی۔ محلے کی دوسری میٹرک اور انٹر پاس عورتوں سے خود کو شروع سے برتر جانتی تھی۔ شادی سے پہلے اپنا بے حد خیال رکھتی تھی۔ انگ انگ پر توجہ دینے اور سب نے سنوارنے کا شوق تھا لیکن عورت کے لئے تو شادی خود فراموشی کی ایک ایسی دلدل ثابت ہوتی ہے جس میں سے نکلنے کے لئے ہمیشہ کسی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے۔

بسمہ اس خود فراموشی کی دلدل سے نکلنے کا سہارا تھی۔ میں نے چونک کر خود پر نگاہ

ڈالی تھی۔ بیکملا کر آنکھوں میں خود کو کھو جاتا تھا۔ سہم سہم کر سوچ تھا۔ ”کیا یہ واقعی میں ہوں؟“ ایک اچھی خاص خوش شکل لڑکی چند روز سال کے عرصے میں ایک بد شکل بد رنگی عورت میں کس طرح تبدیل ہوئی تھی۔ مجھے سراغ نہ مل سکا۔

پورے گھر کا کام اور بھاگ دوڑ بھی جسم کو سنبھالنے میں ناکام رہے تھے۔ فربہی اہل جسم عمر کے پختہ کار ہونے کی تصدیق کرتا تھا۔ بال جو کبھی بڑے سلکی پتھکار ہوا کرتے تھے اب کسی سریل سرکلی لمبی کی دم جیسی پٹیا میں مقید بے چارے سے کندھے پر پڑے رہتے تھے۔ میری جلد بھی کبھی بہت اچھی ہوا کرتی تھی لیکن اب جا بجا چھائیاں اور مہاسوں کے کھلے منہ صاف دکھائی دیتے تھے۔

بسمہ کی شگفتگی اور دلکشی نے مجھ پر اپنا جادو چلایا تھا۔ میں نے وہ سب نوکے ذہن میں تازہ کئے تھے جو میں کبھی خود کو شگفتہ اور دلکش رکھنے کے لئے کیا کرتی تھی۔

صاحب اور بچوں کے کاموں کو میں نے وقت کے ایک خاص دائرے میں قید کیا ورنہ اس سے پیشتر تو دن رات کے چوبیس گھنٹے ان ہی کی چاکری میں صرف ہوتے تھے۔ لیکن اب وقت کا وہ دائرہ پورا ہونے سے قبل ہی میں کوشش کر کے ان سب کے تمام کام فرما دیا کرتی۔ اب بقیہ وقت میں خود کو دینے لگی۔ میں جو تین چار دن بعد غسل خانے میں گھسنے کا وقت، بشکل نکالتی تھی روز نہانے لگی۔ نہانے سے قبل بالوں کو اکثر دہی اور انڈہ بھی لگا لیا کرتی۔ چہرے کو کھیر امل کر صاف کر لیتی۔

رات سونے سے قبل خواہ کتنی ہی دیر ہو جاتی میں اپنے لئے ایک جوڑا ضرور ہی استری کر کے رکھ لیتی تھی۔ کیونکہ دن میں مجھے اپنے کپڑے استری کرنے کا وقت ملتا ہی نہیں تھا۔ بغیر استری کے کپڑے پہن لیا کرتی تھی لیکن بسمہ کو ذرائی کلیں ہوا دیکھ کر میں عی نہیں

میلے کی تقریباً تمام عورتیں استری شدہ لباس پہننے لگی تھیں۔

لباس استری کر کے رکھ لیتی تو جلد کی کلیننگ کا خیال آ جاتا۔ ملائی میں ذرا سا لمیوں نچوڑ کر میں صحن میں آ بیٹھی اور تقریباً آدھا گھنٹہ خوب خوب جلد پر ملتی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے بسمہ کا کھلا کھلا چہرہ میری نگاہوں کے سامنے گھومتا رہتا تھا۔



ایک روز میں اس کے گھر گئی تو پتہ چلا رشید آفس نہیں گیا تھا۔ اس کی طبیعت

خراب تھی۔ الٹی اور دست لگے ہوئے تھے۔ عصر کا وقت تھا اور رشید صحن میں کچھ چارپائی پر لیٹا تھا۔ بسمہ اس کے قریب بیٹھی اس کا سر دبا رہی تھی۔
مجھے دیکھ کر رشید اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”یہ کیا حال بنا رکھا ہے؟“ میں نے اس کی بڑھی ہوئی شیو اور تھکے لباس کو دیکھ کر پوچھا۔ وہ دونوں تھے بھی تو اس قدر غصا سے پسند کہ ذرا سی اونچ نیچ سے فرق پڑتا تھا۔
”کیا بتاؤں باجی! برا حال ہے۔ اتنی التیاں ہو رہی کہ اندر سے آنتیں اکڑ گئی ہیں۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”پھر دستوں نے پیٹ کو کمر سے لگا دیا ہے۔ دو دن میں ایسا لگ رہا ہے کہ دو سالوں سے بیمار ہوں۔“

”کوئی دوا کی وغیرہ نہیں لی؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا۔
”لی ہے مگر فرق نہیں پڑا۔ ابھی پھر ڈاکٹر کے ہاں سے آرہا ہوں۔ اس نے دوا کی بدل دی ہے۔“

”خدا تمہیں شفا دے!“ میں تردد سے بولی۔

وہ چند ایک باتیں کر کے اندر کمرے میں چلا گیا تب میں نے بسمہ کو دیکھا۔ وہ حسب معمول اور حسب عادت صاف ستھری بجی بنی تھی۔ آسانی کپڑے اور آسانی رنگ کی ہونٹیاں۔ ہونٹوں پر گلابی لپ اسٹک کانوں میں موسیے کی کھیاں۔

میں جی ہی جی میں اس کے مصوم حسن کو سراہنے لگی۔
”کچھ بولیں باجی! کچھ بات کریں۔“ وہ اداسی سے بولی تھی۔ میں نے قدرے چونک کر اسے دیکھا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھوں میں نمی تھی اور لہجہ بھی بیگمنا سا تھا۔

”روٹی روٹی سی گلتی ہو بسمہ!“ میں پوچھ بیٹھی۔

”بس باجی.....“ وہ انگلی سے بستر پر لائیں بتانے لگی۔ ”ان کو کچھ ہو جائے تو میرا دل کسی بات میں نہیں لگتا۔ ہر وقت یہی دھیان رہتا ہے کہ میں کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہو گا..... میں تو اس تصور سے ہی آدھی مر جاتی ہوں باجی!“

”پگلی۔ ایسی باتیں نہیں سوچا کرتے۔ بس ہر وقت اللہ سے اچھی امید رکھنی چاہئے۔ ذرا سی بیماری سے تم اس قدر پریشان ہو گئیں۔ ارے یہ التیاں دست تو نوہالو دو بچوں

کو ہو جاتے ہیں۔ معمولی سی بیماری معمولی علاج سے رفع ہو جاتی ہے۔ تم کیا الٹا سیدھا سوچنے لگیں؟“

”بس باجی۔“ اس کی آواز مزید نیچلی ”میں تو ایسی ہی ہوں۔ میری زندگی میں تو جی ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔ بہت چاہتی ہوں انہیں۔“

”بسمہ.....! باجی کو چاہئے پاپا۔“ اندر سے رشید کی آواز آئی تھی۔

”باجی!“ پھر قدرے توقف سے وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اس پگلی کو کچھ کھلا پاپا جانا۔ بیمار میں ہوا ہوں کھانا پیتا اس نے چھوڑا ہوا ہے۔ صبح سے بھوک نہیں کھاتی بس میرا چہرہ ہی دیکھتی جاتی ہے جیسے میں مرنے والا ہوں۔“

بسمہ اس کے الفاظ پر رو پڑی۔

”دیکھا باجی آپ نے... کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ حالانکہ میں تو ان پر کچھ ظاہر بھی نہیں کرتی۔ ان کے کہنے پر میں نے کپڑے بھی بدلے ہیں۔ ان کی پسند کے پھول بھی پہنے ہیں۔ کوئی میرا جی کرتا تھا یہ سب کچھ کرنے کو؟“

”پھر کھانا بھی کھالے میرے کہنے پر۔“ اندر سے رشید بولا۔ ”کھانا کیوں نہیں کھاتی؟“

”اندر سے من مرا تو کھانا اندر جاتا ہی نہیں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

میں اسے کیا سمجھاتی؟ ان دونوں کی یہ مثالی محبت دیکھ کر میں تو بس چپل رہ گئی تھی۔ بسمہ کی صورت دیکھ کر میں ہنسی و سوار نے کی کوشش میں لگ گئی تھی۔ لیکن یہ محبت یہ چاہت یہ اظہار کی بے پایاں دولت..... یہ میں کہاں سے لاتی؟

”دیکھ بسمہ..... میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ رشید اسے دکھانے کو تن کر کھڑا ہو گیا۔

”اچھا چل کپڑا لا۔“ میں اپنی موٹر سائیکل صاف کر دوں۔ کل سے بے چاری میلی کھڑی ہے۔“

”رہنے دیں جی!“ بسمہ ہنسی ہو گئی۔ ”اپنا آپ سنبھالنا مشکل ہے اور موٹر سائیکل کی اس قدر فکر ہے یہ دو دن میلی کھڑی بھی رہی تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔“

”جھوٹ کیوں نہیں پگلی! موٹر ہے موٹر۔ صفائی ستھرائی نہ ہو تو اس کی زندگی آدھی رو

جاتی ہے اس کا جتنا خیال کرو اتنا ہی بندے کا ساتھ دیتی ہے لا کپڑا۔“

”میں نہیں آتی جی۔“ وہ خفا ہو گئی ”بھلا یہ کون سی بات ہوئی۔ جب تک آپ

ٹھیک نہیں ہو جاتے میں نہیں اس کو ہاتھ لگانے دوں گی۔“

”ارے میں ٹھیک ہوں بس۔“

رشید نے ادھر ادھر دیکھ کر خود ہی کپڑاڑھنڈیا اور بیٹھ کر موٹر سائیکل صاف کرنے لگا۔

”یہ تو جی بندے پر ہے دو موٹر کا کتنا خیال رکھ سکتا ہے۔“ دو مسلسل بول رہا تھا۔

”اس کا تو جی جتنا خیال کر دیتے تازا تھاؤ کم ہے۔“

”میری سوت ہے باجی یہ!“ بسہ جل کر مجھ سے مخاطب ہوئی تھی۔

”جب دیکھو اس گھوڑی کے پاس بیٹھے اسے چکا رہے ہوتے ہیں۔“ رشید کی جیسے

سادہ بیماری رخصت ہو گئی تھی۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے بیٹھا اپنی موٹر سائیکل سے باتیں کر رہا تھا۔

میں اس روز زیادہ دیر دہاں نہ بیٹھ سکی۔ اٹھ کر گھر چلی آئی۔ صائمہ اور اسد استخوانوں کی تیاری کر رہے تھے بیلو ان کے پاس بیٹھا اپنے کھلونوں سے کھیل رہا تھا۔ تینوں اپنی اپنی مصروفیت میں گم تھے۔ میں کچھ دیر کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔ وہ میرا اٹاٹھتے تھے میرا کل اٹاٹھا! پھر میں نے گھر پر نگاہ دوڑائی۔ یہ ہمارا اپنا گھر نہ تھا۔ کرائے پر تھا لیکن اسی میں موجود برشے میں نے بنائی تھی۔ میاں کی تنخواہ اتنی نہ تھی کہ گزرا بآسانی ہوا کرتا لیکن اس کے باوجود اس تنخواہ میں سے رقم پس انداز کر کے کینیاں ڈال کر میں نے نکا نکا جوڑ کر آشیانہ بنایا تھا۔ خدا کا شکر تھا گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ بچے تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ زندگی عزت سے گزر رہی تھی۔

لیکن دل ... میں نے دل کو ٹولا۔ دل کہاں تھا؟ کم عمر الہزلڑکیوں کا دل تو ایک ضدی بچے کی مانند ہوتا ہے۔ کیسے کیسے جتن کر کے وہ اس ضدے بچے کو بہائے رکھتی ہیں۔ آئندہ آنے والے دنوں کی آس دلا کر منا کر خود سے لگائے رکھتی ہیں۔ اپنے ضدی بچے میں گمن رہتی ہیں۔ پھر وقت ایسی چال چلتا ہے کہ خبر ہی نہیں دیتی کہ زندگی کے جمیلوں میں کب اس ضدی بچے کا ہاتھ ہاتھ سے چھوٹا اور کب وہ مصروفیت کی بھیڑ میں گم ہوا۔ ہوش آتا ہے تو سفر اتنا بیت چکا ہوتا ہے کہ پھر اس بچے کے ملنے کی امید بھی نہیں رہتی۔

میرا دل بھی ایک ضدی بچہ تھا۔ مجھے یاد آیا شادی سے قبل کتنا انتظار تھا اس رشتے کو جاننے کا جسے میاں بیوی کا رشتہ کہتے ہیں۔ روٹنے منانے کی باتیں پیار محبت کے قصے قسمیں وعدے چاندنی راتوں میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے گھومنے کا انتظار۔ کیسی کیسی حسرتیں

تھیں اس ضدی بچے کی۔ آج بسہ اور رشید کی محبت اور ایک دوسرے سے والہانہ لگاؤ دیکھ کر کیا کچھ نہ یاد آ گیا۔

”بسہ جیسی صورت کسی طور مل بھی جاتی تو رشید جیسی محبت کہاں سے میاں کے دل میں ڈالتی ہیں؟“

انہوں نے تو مکتو ٹھٹھٹ اٹھا کر بھی چاہت کا ایک لفظ نہ بولا تھا تو شادی کے پندرہ سال بعد میں ایسا پیار کہاں سے پاسکتی تھی؟ بائے! اپنا ضدی بچہ اور اس کی وہ سب ضدیں مجھے نوٹ کر یاد آئیں۔ میں منہ سر لپیٹ کر پڑ گئی۔ بار بار رشید کی آواز میرے کانوں میں گونجتی۔

”باجی! اس پٹنی کو کچھ کھلا پلا جانا۔“

”ارے کچھ کھالے بسہ!“ پھر بسہ کی باتیں یاد آئیں۔

”میری زندگی میں تو جی ان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بہت چاہتی ہوں انہیں۔“

ہم نے تو کبھی ایسی باتیں نہ سنی تھیں نہ کہی تھیں۔ شادی ہوئی تو علم ہوا میاں صاحب غصے کے تیز ہیں۔ ذرا احتیاط سے کام لینا ہے۔ اسی احتیاط میں ان سے دور دور رہے وہ بھی اپنے رعب میں رہتے تھے۔ میاں بیوی کے بجائے استاد شاگرد کا رشتہ بن گیا یا غلام اور آقا کا کہہ لیجئے پھر کچھ وقت گزرا۔ مجھے ان کی اور ان کو میری طبیعت کا اندازہ ہو گیا۔ میرا ڈر بھی ختم ہو گیا ان کے رعب میں بھی کمی آتی گئی لیکن اس دوران صائمہ اور اسد کی مصروفیات میں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آنے کا موقع پھر بھی نہ مل سکا جس میں محبت اور چاہت کی ایسی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ بس کام چلتا رہا اور آج تک چل رہا تھا۔ کبھی اتنا احساس بھی نہ ہوا کہ آس پاس نظر آنے والے بیشتر جوڑوں کے درمیان اسی قسم کے روابط قائم تھے۔

میاں بیوی کے رشتے میں پائے جانے والی محبت اور الفت تو زندگی کی خوشیوں کی اساس ہے۔ یہ دو تہمتہ دو تو زندگی بادشاہ کے نرم محبوبے کی مانند گزر جاتی ہے۔ اور خبر بھی نہیں ہوتی کہ کب کہاں کس دیکھ نے چھوٹا اور کس تکلیف سے کیسے دامن چھڑایا۔

ایک دوسرے کی محبت کا ہاتھ تھام کر چلنے والوں کو پیروں میں چھیننے والے ٹکڑوں پتھروں کا تو احساس تک نہیں ہوتا۔ کوئی کتنا زیادہ تکلیف دہ ہو تو بھی ایک دوسرے کی بے لوث رفاقت کام آتی ہے۔ درد جلدی ہکا پڑ جاتا ہے۔

لیٹی بجنوں شیریں فرہاد بیر را بچھا' کسی پنوں کی کہانیوں پر بہت حیرت بھی نہیں ہوتی۔ یہی لگتا ہے کہ ہم خود بھی ایسی ہی کسی کہانی کا کردار ہیں۔ کوئی ہم سے ایسی ہی لافانی اور لاثانی محبت کرتا ہے۔

بسمہ اور رشید کا بیار دیکھ کر نجانے کیا کچھ یاد آیا تھا۔ وہ سب کچھ جو دل مجروح پر بیٹا اور وہ سب کچھ جو نہ بیت سکا کبھی محسوس ہی نہیں کیا۔

میاں صاحب تشریف لائے تو میں یونہی منہ لیپٹے پڑی تھی۔ بچے اپنا کام سمیٹ کر نئی وی لگا کر بیٹھ گئے تھے۔

"ارے بھائی..... کھانا دانا ملتا ہے یا باہر جائیں کہیں؟" وہ لباس تبدیل کر چکے تو میری "جیسے تھے" والی پوزیشن دیکھ کر قریب چلے آئے۔ میرا دل اور بھی بھر آیا۔ بجال ہے جو کبھی اس آدمی نے کھانا پانی اور چائے کے علاوہ کوئی دوسری بات پوچھی ہو۔ یہ بھی نہیں پوچھتے کہ کیا قریب المرگ ہو جو یوں انوائی کنوائی لئے پڑی ہو۔

"لے لیں کھانا..... پکا رکھا ہے۔" میں رو پانسی ہو کر بولی۔
"ہائیں! کیا مطلب؟" پندرہ سالوں میں یہ پہلی انوکھی بات تھی سو حیران ہوئے بغیر نہ رو پائے۔

"مطلب یہ کہ میرا جی ٹھیک نہیں ہے..... میں نے منہ پر سے کپڑا بھی نہیں ہٹایا تھا۔ یہ جی کیا ہوتا ہے؟ اور آج اس کے خراب ہونے کی وجہ کیا ہوئی؟" وہ بے نیازی سے پوچھنے لگے۔ میں نے چہرے پر سے کپڑا اٹھایا اور انہیں غور سے دیکھنے لگی۔ یوں جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔

"کیا ہو گیا ہے آج تمہیں؟" وہ جھلا ہی گئے۔

میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ کیا ناقد ری می ناقد ری تھی۔ کتنے دنوں سے اپنا خیال رکھ رہی تھی۔ اپنا عورت پن بھول کر خود کو الہزی و شیرہ جان کر نوک پلک سنوارنے میں لگ گئی تھی۔ یہ بھول ہی گئی کہ دیکھنے والی نگاہ نہ تو تو ہیرا بھی کسی ویران کھائی میں پڑا کوئلہ برابر ہوتا ہے۔ ہیرا تو ہیرا تب ہوتا ہے جب اسے تراشا جائے زیور میں لگایا جائے سراہا جائے۔ میں روئے جا رہی تھی اور وہ مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"نیکم! معاف کیا ہے؟" آخر کو وہ قدرے پریشان ہو ہی گئے۔

"یہ بتائیں آپ کو مجھ میں کسی تبدیلی کا احساس ہوا؟"

"تبدیلی..... کیسی تبدیلی؟" وہ کچھ اور پریشان ہوئے۔

"مجھے تو نہیں پتا چل رہا ہے۔ کیا بات ہو گئی تم ہی بتاؤ؟"

"یا اللہ..... سر پھوڑنے کو اگر پتھر دینا تھا تو پھر دل کی جگہ بھی کوئی پتھر ہی لگتا" دل کی جگہ شیشہ اور شوہر کے نام پر پتھر..... عمر کیسے گزرے گی؟" میں سسک پڑی۔ جس کی خاطر مینے بھر سے آئینے توڑ دی تھی اس نے کتنی جلدی دل توڑ ڈالا یہ دو لفظ کہہ کر حالانکہ باجرہ کل ہی کہہ رہی تھی کہ میں نکھری نکلنے لگی ہوں۔

"کسی لیڈی ڈاکٹر سے مل لو۔" وہ مزید گویا ہوئے "میں تو واقعی پریشان ہو گیا ہوں..... آج کے دور میں تو دو بچے ہی بہت ہیں۔ ہمارے تو پھر تین ہیں۔ چوتھے کی آمد سے تو اخراجات....."

"کیا کہے جارہے ہیں؟" میں بھٹانٹھی "میں نے ایسا کب کہا؟"

"پھر یہ کس تبدیلی کی نشان دہی ہو رہی ہے؟" وہ مجھ سے زیادہ بھٹائے۔

"ہائے ہائے..... اقبال صاحب.....! آپ نے مجھے بہت مانوس کیا ہے....."

میری آواز رندہ گئی۔ "آج پندرہ سالوں میں پہلی بار شدت سے یہ احساس ہو رہا ہے کہ زندگی جیسی نعمت جو صرف ایک بار ملتی ہے..... اس میں محبت کے نام کا خانہ روز اول سے خالی پڑا ہے اب تک خالی ہے۔ کیسی ستم ظریفی ہے..... عورت کو محبت نہ ملے؟" میں پھر رونے لگی۔

"ایسا ہی ہے جیسے پیاسی دھرتی کو بادل سے بوند بھر پانی نہ ملے گھستوں کو باد صبا نہ ملے خالی جام کو شراب نہ ملے....."

"کیا بک رہی ہو بیگم؟" ان کی صورت پر بارہ بجنے لگے۔

"یہ وہ حقیقت ہے جو آپ کو ضرور ہی جاننا چاہئے آپ جیسے مرد جو اپنی جھوٹی اتا کی تسکین کی خاطر اپنی عورت کو محبت سے محروم رکھتے ہیں۔ وہ مرد جو یہ سوچتے ہیں کہ محبت کے شیرینی کے دو بول عورت کو اس کی اوقات نہ بھلا دیں وہ غلام سے آقا بننے کا نہ سوچنے لگے۔ محبت تو واقعی سونے کا تاج ہے جس عورت کے سر سجا ہو وہی حسینہ عالم ہے لیکن اقبال صاحب جو مرد یہ تاج اپنی بیوی کو پہناتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اس کی داسی بن جاتی ہے۔ بے سول بک کر انمول ہو جاتی ہے۔ جیسے بسمہ!"

”زہرہ.....! آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“ انہوں نے گھبرا کر میرا ہاتھ تھام لیا۔
 ”ایک اندھے غلام کو پہلی بار اپنی غلامی کا احساس ہوا ہے تو بیروں پر بڑی زنجیر
 چبھنے لگی ہے..... حالانکہ زنجیر کو پیر میں پڑے تو عرصہ ہو گیا۔“ میں نے تاسف سے سر
 بلایا۔

”کیسی زنجیر؟“ میں نے انہیں دیکھا۔

”یہ ٹھیک ہے اقبال صاحب کہ عورت گھربانے کو ہی پیدا کی گئی ہے۔ آگے تخلیق
 کے عمل کو جاری رکھنے کے لئے ہی تخلیق کی گئی ہے..... اپنا گھر بنا کر سجا سنا کر بچے پیدا
 کر کے پال پوس کر عورت اپنی پیدائش کا مقصد پورا کرتی ہے..... لیکن یہ بھی روشن حقیقت
 ہے کہ اس عورت کے سینے میں اس کے خالق نے ایک نرم و نازک پودا لگایا ہے جسے دل کہتے
 ہیں۔ اس پودے کی حفاظت کرنا اسے محبت کی خوراک دینا اسے زمانے کی تلخیوں کی دھوپ
 سے بچانا مرد کا کام ہے۔“

کتنے مرد ہیں جو اپنا یہ کام دیانت داری سے پورا کرتے ہیں؟ جو مرد اپنا یہ کام
 دیانت داری سے نہیں کرتے ان کی عورتوں کو گھر قید خانہ اور زندگی غلامی لگتی ہے اور جو عورتیں
 یہ سب کچھ محسوس نہ کریں وہ اندھا غلام ہوتی ہیں۔ میں بھی آج تک اندھا غلام نبی رہی۔
 پیدائشی جرم! جسے غلامی کا احساس تک نہیں ہوتا..... مگر بسہ اور رشید کو دیکھ کر.....“

”کیا دیکھ لیا آخر؟“ وہ جھلا کر کھڑے ہو گئے ”نبانے آج تمہیں ہو کیا گیا ہے؟
 بھئی! میں یہ سب فضول خرافات نہیں من سکنا۔ تمہیں شکایت ہے تو شکایت ہی سہی۔ کسی بے
 وقوف عورت نے کان بھرے اور یہ محترمہ شروع ہو گئیں۔ کھانا لا دو مجھے۔“

وہ کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں حسرت کا نمونہ بنی انہیں جاتا دیکھتی رہی۔ محبت
 کی کمی کے احساس کا وہ پہلا اور آخری دورہ تھا جو مجھے پڑا۔ اس کے بعد میں نے کبھی اقبال
 صاحب سے کچھ نہیں کہا۔ چند دن کے بعد ہی ایک خوشخبری ملی۔ اقبال صاحب کی ترقی ہو گئی
 اور تبادلہ بھی دوسرے شہر جا کر چارج سنبھالنے کے لئے آرڈر آ گئے۔

میں خوش بھی تھی مترد بھی۔ ترقی کی خوشی تھی اور آغا نانا سارا ماحول بدل جانے
 کے خیال سے پریشان بھی۔ یہ محلہ تو اپنے گھر کی مانند تھا۔ سب جانتے تھے پہچانتے تھے
 عزت کرتے تھے ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔ نئی جگہ لوگوں کا تصور خوش بھی کر رہا تھا

اور پریشان بھی۔ اقبال صاحب دوسرے شہر چلے گئے۔ چند دن بعد ہم لوگوں کو بھی کوچ کرنا
 تھا۔ میں گھر کا ضروری سامان پیک کرتی عزیز رشتہ داروں سے محلہ داروں سے ملاقاتیں
 کرتی پھر رہی تھی۔ سب سے آخر میں بسہ کے گھر بھی گئی۔

دو ہرے رنگ کا لباس پہنے ہری اور لال چوڑیوں سے کلاسیاں بھرے خوش خوش
 پھر رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر اور بھی خوش ہوئی۔
 ”آئیں باجی! میں ایک خوشخبری سنانے آ رہی تھی اچھا ہوا جو آپ خود ہی چلی
 آئیں۔“ اس نے منھائی کا ڈبہ میرے سامنے رکھ دیا۔
 ”منہ میٹھا کریں۔“

”خبر تو سناؤ۔ منہ بھی میٹھا کرتے ہیں۔“ میں نے اس کا ہمیشہ کی طرح چمکتا
 روشن چہرہ دیکھا۔

”ہم نے یہ گھر خریدا لیا ہے۔ پورے ایک لاکھ پچاس ہزار میں۔“
 ”ہائیں بڑا سستا بیچا دینو کا کائن؟ خیر بہت مبارک ہو تمہیں۔“ میں نے برنی کا
 نکلا منہ میں رکھا۔

”وہ جی اسے ضرورت تھی پیسوں کی اور پھر یہ گھر بک بھی نہیں رہا تھا۔ چھوٹا بہت
 ہے تا..... ہمارے لئے تو خیر بہت اچھا ہے۔“
 ”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہماری سمیٹنی نکلی تھی پچاس ہزار کی پچاس میں نے اپنا زیور بیچ کر کئے باقی انکے
 رشید نے آفس سے قرضہ لے لیا۔ آہستہ آہستہ کتنا رہے گا۔“ وہ مجھے اپنوں کی طرح بتا رہی
 تھی۔

”چلو اچھا ہوا۔ گھر تو اپنا ہو گیا تا! قرضہ بھی اتر جائے گا اور زیور بھی نیا بن جائے
 گا۔ شوہر خیال کرنے والا ہو۔ تو عورت کو گھنوں کی ضرورت بھی نہیں ہوتی اصل زیور تو شوہر
 کی محبت ہے۔“

”سچ بولیں باجی!“ وہ شرما کر بولی ”یہ تو جی بہت چاہتے ہیں مجھے..... اپنی جان
 سے زیادہ۔“ میرے دل سے پھر ہوک اٹھی۔
 ”بسہ.....! میں بھی ایک خبر سنانے آئی تھی۔ تمہیں۔“ میں نے خود پر قابو پا کر

سائنس بھر کر کہا۔ "اقبال صاحب کا تبادلہ ہو گیا ہے۔ ہم لوگ دوسرے شہر جا رہے ہیں۔"
 "ہائے سچ باجی!" وہ روٹا ہوا ہو گئی۔ "مجھے تو اداس کر دیا آپ نے۔"
 "اداس کیوں ہوتی ہو؟" میں نے اس کا گال تھپتھپایا۔ "جنگھیں تو بھر ہی جاتی ہیں۔ یادیں مدھم پڑ جاتی ہیں کسی کے جانے سے فرق تو ہوا ہی پڑتا ہے۔"
 "بچی کہتی ہیں باجی۔" رشید نے کس دقت چلا آیا تھا۔ "پھر بھی اچھے لوگ مشکل سے بھولتے ہیں۔" بسمہ! تو نے باجی کو دوسری خوشخبری نہیں سنائی؟ "وہ بہت شوخ ہو رہا تھا۔ بسمہ نے اس کو گھور کر دیکھا اور جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ دوسری خبر کیا ہو سکتی تھی مجھے از خود پتا چل گیا۔
 رشید ہنستا ہوا صحن میں اپنی موٹر سائیکل کے پاس چلا گیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے صاف کرنے لگا۔

ان میاں بیوی کی مثالی محبت کو نظر نہ لکھنے کی دعا کرتی میں واپس چلی آئی۔
 شہر بدلا زندگی بدل گئی۔ سال تہج کے دانوں کی طرح ایک کے بعد ایک گرتے چلے گئے۔ عمر گزرنے کا بھی پتہ چلتا ہے؟
 دس سال گزر گئے۔ میری صائمہ کی شادی ہو گئی۔ وہ بیاہ کر دوسرے شہر چلی گئی۔ اسدا انجینئرنگ کالج چلا گیا۔ بلو نے میٹرک کر لیا۔

تب ایک دن اقبال صاحب نے مجھے ریٹائر ہونے کی نوید سنائی۔ عمر کا آخری حصہ کس قدر جلد سر پر آن کھڑا ہوا تھا۔..... پلٹ کر کچھ دیکھنے کی، ٹھہر کر کچھ سوچنے کی کبھی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ اقبال صاحب ریٹائر ہوئے تو ہم واپس پہلے شہر لوٹ آئے۔ یہ آبائی شہر تھا۔ یہاں میرا میکہ تھا، اقبال صاحب کے رشتے دار تھے۔ ہم نے ٹھکے سے ملے پیسوں سے یہیں ایک گھر خرید لیا۔ کچھ عرصہ نیا گھر سیٹ کرنے میں گزر گیا پھر مجھے پرانے عزیزوں رشتہ داروں کی یاد ستائی۔ لوگوں سے بچنے کے عرصہ ہو گیا تھا۔

میں اب فارغ تھی۔ بیٹی بیاہ دی تھی۔ بیٹے جوان ہو گئے تھے۔ جی بھر کر گھومتی پھرتی تھی۔ کبھی کسی کے گھر، کبھی کسی کے گھر۔

تب ایک دن مجھے اپنی پرانی بھولی ہاجرہ یاد آئی، دوسری پڑ دن شریا کی بھی یاد ستائی پھر مجھے بسمہ یاد آئی۔ بسمہ! جس کی یاد آج بھی اولین شباب کے پرفیوم کی مانند تھی۔ جسے

محسوس کر کے انسان عجیب سی کیفیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ پھر پرانے مٹنے میں گئی۔ وہاں سے بیشتر لوگ جا چکے تھے۔ کیونکہ ہماری طرح زیادہ تر لوگ وہاں کرائے کے گھروں میں آباد تھے۔ باجرہ البتہ وہیں تھی۔ اس سے مل کر مجھے غم ہوا، بسمہ مر گئی تھی۔ میں سنانے میں رہ گئی۔ وہ خوشبو وہ چاندنی، دو روشنی کا پیکر بسمہ! بھلا کیسے مر گئی؟ میں باجرہ کے گھر زیادہ دیر نہ بیٹھ سکی۔ وہاں سے نکل کر سیدھی رشید کے گھر چلی آئی۔

اندر کا ماحول تقریباً وہی تھا۔ آج سے دس سال پیشتر والا۔ فرنیچر بھی وہی پردے بھی وہی ہاں البتہ دیوار پر لگی تصویر بدل گئی تھی۔ رشید کے ساتھ شمع کی تصویر تھی۔ اس کی نئی دہن وہ بھی اچھی لڑکی تھی۔ مجھ سے تپاک سے ملی۔ رشید سے اس کی شادی کو چھ سال ہو گئے تھے۔ بسمہ کے دونوں بچوں کی اب وہی ماں تھی۔

"ان کی ماں بڑی اچھی عورت تھی۔" میں نے آٹھ سالہ بیٹی اور دس سالہ بیٹے کو ایک دوسرے سے کھیلتا دیکھ کر تاسف سے کہا تھا۔ "بہت پیاری تھی نرم و نازک سی!" شمع پہلو بدل کر مسکرا دی۔

"ہاں جی سنا تو ہے۔ مگر یہ کہتے ہیں..... مجھ سے انہیں زیادہ لگاؤ ہے!"

"جھمن۔" میرے اندر کچھ ٹوٹا تھا "کون رشید؟"

"ہاں جی..... بہت چاہتے ہیں مجھے....." میں اٹھ کر باہر چلی آئی۔ رشید بیٹوں کے بل بیٹھا موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"بڑے دن بعد آئیں باجی؟"

"ہاں رشید! تم سناؤ بسمہ کا سن کر بہت افسوس ہوا، کیا ہوا تھا اسے؟"

"بس جی بے چاری کی قسمت ہی خراب تھی۔ دونوں بچے آپریشن سے ہوئے۔

بیاریاں جان کو چٹ گئیں، بس جی چلی گئی بے چاری!" اس کی آنکھوں میں کوئی پرانا خواب نہ

جاگا تھا۔ میں تو بس رشید کی صورت دیکھتی رہی۔ وہ اسے گھر دے گئی تھی دو بچے دے گئی تھی

اپنی زندگی دے گئی تھی۔ وہ اس کا ذکر کے پھر بے فکری سے اپنی موٹر سائیکل صاف کر رہا تھا۔

"جنگھیں تو بھر جاتی ہیں۔ یادیں مدھم پڑ جاتی ہیں کسی کے جانے سے فرق تو ہوا

ہی پڑتا ہے۔" مجھے برسوں پہلے اسی جگہ کہے گئے اپنے الفاظ یاد آئے۔

لیکن رشید نے یہ بھی تو کہا تھا کہ اچھے لوگ مشکل سے بھولتے ہیں۔ اس نے تو

اپنے کہے کا پاس بھی نہ کیا۔

”تمہاری موٹر سائیکل تو آج بھی بالکل نئی لگتی ہے رشید!“ میں نے سانس بھر کر سوچوں کے اثر سے نکلنے کے لئے برسبیل تذکرہ کہا تھا۔

”ہاں جی!“ وہ خوش ہو گیا۔ ”یہ تو جی زندگی کی ساتھی ہوتی ہے۔ اس کا تو جی جتنا خیال کرو جتنا جی جان سے اسے سنوارو..... یہ اتنا ہی ساتھ دیتی ہے۔“ میں سر جھکا کر باہر نکل آئی۔

”جو خیالات ایک بے جان موٹر کے بارے میں رکھتے ہو وہی خیالات اگر ایک سانس لیتی عورت کے لئے رکھتے تو..... بسمہ کیوں مرتی؟“ میں تاسف سے دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی چلی جا رہی تھی۔



چاند سی دہن

آج عماد الدین گھر لوٹ رہا ہے۔ میں بے پناہ خوش ہوں۔ اس قدر خوش کہ مجھے اپنے اندر خوشی کا ایک سمندر موجزن محسوس ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج میری عمر بھر کی خواہشات کی تکمیل ہو گئی ہے۔ میری ساری دعائیں مقبول ہوئیں۔ میں ہر پریشانی، ہر فکر سے پاک بالکل ہلکی بھلکی ہو گئی ہوں۔

ابھی کل کی بات لگتی ہے۔ عماد کا داخلہ! انجینئرنگ یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ وہ چار سال کے لئے مجھے چھوڑ کر دوسرے شہر جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا لیکن میں بظاہر خوش اندر سے بے حد فکر مند اور پریشان تھی۔ زندگی میں کبھی اس سے جدا جو نہ ہوئی تھی۔ پل پل اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا تھا۔ ہر لمحہ اس کی حفاظت کی تھی۔ وہ ایک ننھی سی کونیل کی مانند تھا۔ میں نے اسے اپنے خون دل سے سینچا تھا۔ اپنی تمناؤں کو خاک کر کے اسے پر دان چڑھایا تھا۔ پھر اس کی اس جدائی سے 'خواہ وہ عارضی ہی تھی میں کیونکر نہ پریشان ہوتی؟ لیکن میں مجبور بھی تھی یہ اس کے بہتر مستقبل کا سوال تھا۔ اسے آگے بہت آگے جانا تھا۔ بڑا آدمی بننا تھا اور یہ میری ہی آنکھوں کا سب سے پرانا اور سب سے دیرینہ خواب تھا۔ میری زندگی میں عماد کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ سو وہ ہی میری زندگی تھا۔

میں نے ایک نگاہ بڑی بے چینی سے وال کلاک پر ڈالی۔ گیارہ بج رہے تھے۔ وہ بس پہنچنے ہی والا تھا۔ اسے ساڑھے دس بجے ٹرین سے پہنچنا تھا۔ پھر اسٹیشن سے گھر تک کا فاصلہ تقریباً گھنٹہ بھر کا تھا۔ میں اسے لینے کے لئے اسٹیشن جانا چاہتی تھی۔ لیکن عماد نے مجھے منع کر دیا تھا۔

”سردی بہت زیادہ ہے ائی! آپ گھر پر ہی ٹھہریے گا میں خود اسٹیشن سے گھر پہنچ جاؤں گا۔ اب میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں..... جوان ہو گیا ہوں۔“

وہ ہنس رہا تھا۔ اس کے لہجے میں شرارت بول رہی تھی۔ میں نے جب ریسپور کریڈل پر ڈالا تو اس کا آخری فقرہ میرے کانوں میں گونج رہا تھا۔

”اب میں کوئی بچہ تھوڑا ہی ہوں۔ جوان ہو گیا ہوں۔“

اور تب سے اب تک میرے اندر سکون اور طمانیت کا بھرپور احساس موجود تھا۔ میری ریاضت پوری ہو گئی تھی۔ میرا سفر مکمل ہوا تھا۔ میرا عماد جوان ہو گیا تھا۔ آج تک میں نے اسے تحفظ کا بھرپور احساس دینے کی کوشش کی تھی اب مجھے اس کے تصور سے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

میں اپنے فلیٹ کی بالکنی میں آکھڑی ہوئی۔ نیچے سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ میرا عماد بھی اس شہر کی سڑک پر محو سفر ہو گا۔ وہ بس پہنچتا ہی ہو گا۔

میں انتظار کی شدید ترین کیفیت کا شکار تھی جب بیل بجی۔ میرے دل کی دھڑکن لمحہ بھر کے لئے رکی پھر تیز تر ہو گئی۔ تقریباً دوڑتی ہوئی میں دروازے پر پہنچی اور میں نے دروازہ کھول دیا۔ میرا چوبیس سالہ خوبڑ جوان بیٹا میری نظروں کے سامنے تھا۔

”ای!“

نبجانے اچانک ہی کیا ہوا میں نے اس کے سینے سے لگ کر بلک کر رونا شروع کر دیا۔

”عماد۔ میرا بیٹا۔ میری جان.....“

”ای..... پلیز ای!“ وہ مجھے سینے سے لگائے اندر لے آیا۔ ”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ خوشی کے موقع پر بھی کوئی روتا ہے۔“

”نہم سبتے سبتے جن کی آنکھیں پتھر جاکیں وہ خوشی کے موقع پر ہی رو دیا کرتے ہیں میرے بیٹے!“ میرے آنسو کی طور نہ ختم رہے تھے۔

”نہم اور تکلیفوں کا دور گزر گیا ائی! اب ہمارے چاروں طرف خوشی ہی خوشی رقصاں ہوگی انشاء اللہ۔“

اس نے جیب سے دو مل نکل کر میرے آنسو پونچھے۔ ”آپ نے تو مجھے ڈرایا دیا تھا۔“

”اچھا۔ اب تم فریش ہو تو میں تمہارے لئے کھانا نکالتی ہوں۔ میں نے ساری چیزیں تمہاری پسند کی بنائی ہیں۔“ میں ہشکل خود پر قابو پاسکی تھی۔

”میں جانتا تھا۔ اسی لئے میں نے ٹرین میں کچھ نہیں کھایا۔ سخت بھوک محسوس ہو رہی ہے۔“

وہ اٹھ کر گیا تو میں نے اس کا بیک کھول کر اس کے لئے کپڑے نکالے۔ کافی رنگ کی جرسی میرے ہاتھوں میں آگئی۔ یہ جرسی پچھلے سال میں نے اس کے لئے بنی تھی۔ یہ ایک بڑا مشکل ڈیزائن تھا جسے میں نے بہت محنت سے پورا کیا تھا۔ میں کچھ دیر کھڑی اسی جرسی کی بناوٹ پر غور کرتی رہی۔ پھر اسے کپڑوں پر رکھ کر کچن میں چلی آئی۔ آج میں فجر کی نماز پڑھ کر ہی اس کے لئے کھانا پکانے میں لگ گئی تھی۔

میں نے اس کی پسند کی کتنی ہی چیزیں بنا ڈالی تھیں۔

پاؤڈر شامی کباب، پسندے، مسور کی دال کی پھلکیاں، شامی بکڑے اور اورنگ کیک۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر آ کر بیٹھا تو حیران رہ گیا۔

”ارے..... میری ماں! اتنا ہلکا کیا ہے آپ نے خود کو؟ کب سے لگی ہوئی ہیں؟“

”فجر سے!“ میں فخر سے مسکرانے لگی۔ ”اور ہلکا نہیں ہو گئی ہوں۔ خود کو بہت چاق و چوبند اور فریش محسوس کر رہی ہوں۔“

”فریش تو آپ ہمیشہ ہی رہتی ہیں۔ میری ماں تو سدا بہار ہے۔ پتا ہے ائی! میرے دوست مجھ سے اتنا جیلس ہوتے ہیں اس بات پر۔ ان سب کی مائیں اتنی بوڑھی بوڑھی سی ہیں اور میری ماں۔ ایک دم فریش اور خوبصورت۔ آپ ماں نہیں میری باجی لگتی ہیں۔“

وہ کھاتے ہوئے بولتا جا رہا تھا اور میری آنکھیں سوچوں کی دھند میں کھور رہی تھیں۔

میں نے بی اے کیا تھا تو والدین نے اگلے مہینے حماد الدین سے میرا بیاہ کر دیا تھا۔ میں محض بیس برس کی تھی۔ اگلے برس یعنی اکیس سال کی عمر میں عماد کی ماں بن گئی تھیں اور چوبیس سال کی عمر میں حماد الدین کی بیوہ!

بس! میری خوشیوں کی بس اتنی ہی عمر تھی۔ والدین کے گھر لوٹ کر آئی تو احساس

باپ زندہ ہوتا تو اسے بہتر زندگی میسر ہوتی، عماد کو کوئی احساس کمتری نہ رہا جائے۔
خدا کا شکر ہے۔ اس نے میری تمام خواہشات کو پورا کر دیا۔ میری ہتھیلیوں پر رقم
ہر دنا کو پورا کر دیا۔ لیکن نہیں! ایک دعا ابھی باقی ہے۔

”عماد!“ میں نے کچھ دن بعد اسے مخاطب کیا۔ ”بیٹا! میں چاہتی ہوں اب اپنے
آخری فرض سے سبکدوش ہوں۔ میری خواہش ہے کہ میں اس گھر میں تمہاری دہن لے آؤں۔“
”امی!“ وہ چونک اٹھا۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟ ابھی تو میں نے عملی زندگی کے
میدان میں رکنے کے لئے پہلا قدم اٹھایا ہی ہے۔ میں بھلا اس قدر جلد شادی کے متعلق
کیسے سوچ سکتا ہوں؟“

”مگر میں نے سوچ لیا ہے۔“ میں اطمینان سے بولی ”تم نے امتیازی نمبروں سے
امتحان پاس کیا ہے۔ آفرز آنا شروع ہو چکی ہیں۔ چند ماہ میں ہی تم اپنی بہترین عملی زندگی کا
آغاز کر دو گے۔ انشاء اللہ میں چاہتی ہوں اس کے ساتھ ہی تم اپنی ازدواجی زندگی کا آغاز
بھی کر دو۔ زندگی بہت مختصر شے کا نام ہے۔ عماد۔! یہاں پلک جھپکتے بچپن، جوانی اور بڑھاپا
گزر جاتا ہے۔ میں نے ہمیشہ تمہارے لئے بہترین چیزوں کی خواہش کی ہے۔ یہ کہ تم
بہترین طریقے سے اپنی عمر گزارو۔ ہر کام وقت پر، سہل انداز میں کر دو۔ خوشیوں کا بھی وقت
ہوتا ہے۔ عماد.....! انہیں وقت پر حاصل کرنا ہی اچھا ہوتا ہے۔ وقت گزر جائے تو خوشیوں
میں انوکھا پن نہیں رہتا۔ یہی وقت ہے بچے ان باتوں کا۔ تم نے بڑی لگن اور جذبے سے
اپنی تعلیم مکمل کر لی ہے۔ اب تم زندگی میں آنے والی فراغت اور خوبصورتی کو محسوس کر دو۔“

وہ سر جھٹکائے میری باتوں پر غور کرتا رہا اور میں جانتی تھی وہ انکار نہیں کرے گا اس
لئے کہ اس نے کبھی میری بات کو رد نہیں کیا۔ میں نے جس جذبے سے اس کی پرورش کی تھی
یہ اس کا انعام تھا کہ عماد الدین ایک بے حد فرمانبردار اور اطاعت گزار بیٹا تھا۔ اس نے کبھی
میری کسی بات پر ”نہ“ کہنا سیکھا ہی نہ تھا۔

میرے ذہن میں عماد کے لئے کئی ایک لڑکیاں تھیں۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ
جب انتخاب کا وقت آئے تو میں اور عماد باہمی مشورے سے ان میں سے کسی ایک لڑکی کو
منتخب کر لیں گے۔ ساری کی ساری بہت سنبھلی ہوئی، پڑھی لکھی لڑکیاں تھیں لیکن اب جبکہ وہ

ہوا کہ اب یہ گھر ماں باپ کا نہیں رہا، بھاد جوں کا ہو گیا ہے اور میری اور میرے بیٹے کی وجہ
سے انہیں ان کا گھر چھوڑنا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے حماد الدین کی چھوڑی ہوئی رقم سے فلیٹ
خرید لیا اور عماد اور اپنی ماں کو لے کر یہاں آ بسی۔ عماد کو میں نے اسکول میں داخل کرایا اور
خود یونیورسٹی میں ایڈمیشن لے لیا۔ میں ماسٹرز کر کے لیکچرر شپ حاصل کرنا چاہتی تھی کیونکہ
زندگی طویل تھی اور حماد الدین کی چھوڑی ہوئی رقم بے حد مختصر!

میں ماسٹرز کرنے لگی۔ کم عمر تھی، خوبصورت بھی تھی۔ کئی نظروں میں سوال ابھرا، کئی
ہاتھ دراز ہوئے لیکن میں کسی ہاتھ پر اپنا ہاتھ نہ رکھ سکی۔ میرے ہاتھ ننھے عماد کی محبت نے
باندھے دیئے تھے کسی اور جانب توجہ دینے کے لئے مجھے عماد کو نظر انداز کرنا پڑتا اور ایسا
کرنے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی۔ عماد میری زندگی کا عنوان تھا۔ زندگی کی کتاب کو کسی نئے
نام کی ضرورت نہ رہی تھی۔ میں نے ماسٹرز کر کے لیکچرر شپ حاصل کر لی۔ زیست کی گاڑی
قدرے سہل انداز میں پھل پڑی میری ماں نے مجھ پر بہت زور دیا کہ میں دوسری شادی کر
لوں۔ وہ عماد کی پرورش بہت اچھے طریقے سے کر سکتی ہے۔ لیکن میں کسی طور پر نہ مانی۔ زندگی
میں کئی چیزوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ لیکن عماد کی محبت ہر کمی کو نا محسوس انداز میں مکمل کر دیتی
تھی۔ میں پڑھ رہی اور اداس ہوتی تو اس کی ایک مسکراہٹ مجھے اندر تک شاداب کر ڈالتی۔
کفن راہوں پر چلتے چلتے میرا سانس پھولتا تو اس کے ننھے ننھے ہازد میری گردن میں جمائے
ہوتے اور میں بالکل پرسکون ہو جاتی۔ میرا سانس بحال ہو جاتا۔ اکھڑتے قدم پھر سے جم
جاتے۔ عورت کے برنام اور عورت پن کے تمام جذبیوں کو فراموش کر کے میں محض ماں رہ گئی
اور ”ماں“ مبر اور استقامت کا دوسرا نام ہے۔ ”ماں“ ہمیشہ ”ماں“ رہتی ہے کبھی نہیں ٹھکتی
کبھی نہیں مرجھاتی۔

عماد کو بھی میں نے ہمیشہ بہترین اسکولوں میں پڑھایا۔ اپنی آمدنی کا بڑا حصہ اس
کی تعلیم پر صرف کیا۔ اپنے اوپر تو میں نے زندگی کی ہر خوشی حرام کی ہوئی تھی۔ ایک ایک جوڑا
میں برسوں چلاتی تھی۔ میک اپ اور زیور کی میں نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی۔ گھر
کے بجٹ میں نہایت کھینچ تان کر پورا کیا کرتی تھی۔ میری محض ایک ہی آواز تھی۔ زندگی کی
”دوڑ“ میں میرا عماد کہیں کسی سے پیچھے نہ رہ جائے، کبھی عماد کو یہ خلش نہ ستائے کہ اگر اس کا

لہر سر پر اکھڑا ہوا تھا مجھے کوئی بھی لڑکی اپنے معیار پر پوری اترتی نظر نہ آ رہی تھی۔
میں نے تنہائی میں کئی مرتبہ سوچا۔

میری بڑی بہن کی دو بیٹیاں تھیں۔ فائزہ اور منزہ دونوں ہی بہت پیاری پڑھی لکھی نیک سیرت بچیاں تھیں۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میرا بیٹا عماد بے حد خور و بلند قامت نوجوان تھا جبکہ فائزہ اور منزہ شکل صورت کی تو بھلی تھیں لیکن ان کے قد بہت چھوٹے تھے۔ میرے خیال میں عماد کے ساتھ ان کا جوڑ نہیں بنتا تھا۔

”میاں بیوی کے قد میں مناسبت ہو تو جوڑی بھلی لگتی ہے۔“ میں نے کئی بار سوچا۔ ”وہ دونوں ہی عماد کے ساتھ نہیں چھیں گی۔“

میں نے اپنی لسٹ سے ان دونوں کو نکال دیا۔

میرے بچپن کی دوست عارفہ کی بیٹی سیما بھی مجھے بہت پسند تھی۔ وہ بے حد حسین لڑکی تھی۔ گوری رنگت سیاہ چمکتی آنکھیں خوبصورت گھنے بال۔ میں اسے دیکھ کر سہوت رہ جایا کرتی تھی۔ ہمیشہ سے ہی اسے دیکھ کر میرے جی میں یہ خیال بچتا تھا کہ میں عارفہ سے اسے عماد کے لئے مانگ لوں۔

لیکن اب مجھے دھیان آ رہا تھا کہ سیما بچپن سے ہی ذرا غصیلی اور ضدی واقعی ہوئی تھی۔ ذرا ذرا سی بات کے لئے وہ عارفہ کو اکثر پریشان رکھتی تھی۔ بھلا ایسی لڑکی کو میں اپنے عماد کے لئے کیسے بیاہ لاتی۔ وہ تو بے حد سلجھا ہوا نرم مزاج بچہ تھا۔ اس کے لئے تو شبنم جیسی ٹھنڈی لڑکی ہونی چاہئے تھی تاکہ دونوں کی زندگی خوشگوار انداز میں گزرتی۔

چچا زاد بھائی طفیل کی بڑی بیٹی مومنہ کو بھی میں نے ہمیشہ سے نظر میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بڑی خوبیوں والی لڑکی تھی۔ خوبصورت بھی تھی اور خوش مزاج بھی لیکن اب مجھے یہاں بھی ایک مسئلہ نظر آ رہا تھا۔ مومنہ ڈاکٹر بن گئی تھی اور اپنی پریکٹس کرتی تھی اور ساری عمر نوکری کر کے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا تھا کہ نوکری پیشہ عورت گھر اور گھر والوں کو وہ بھرپور توجہ نہیں دے پاتی جو ایک عورت کو دینی چاہئے۔ ایک مکمل اور پرسکون گھر کو ایک مکمل اور پرسکون عورت کی ضرورت ہوتی ہے اور نوکری عورت کو نہ مکمل ہونے دیتی ہے نہ پرسکون۔

میں نے مومنہ کو بھی رینجکٹ کر دیا۔ گویا وہ تمام لڑکیاں جو عرصہ دراز سے میری لسٹ میں شامل تھیں وقت آنے پر از خود لسٹ سے باہر ہو گئیں۔

عماد سے میں نے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ وہ ہنس دیا۔ ”عماد! میں چاہتی ہوں کہ ایک بھر پور مکمل لڑکی ہو جو ہمارا گھر خوشیوں سے بھر دے۔ اپنے بیٹے کے لئے میں چاندی دہن لانا چاہتی ہوں۔“

”میں نے آپ کو منع کیا ہے؟“ وہ شونخ ہوا ”آپ سورج چاند ستارہ جیسی مرضی مخلوق لے آئیں۔“

”تم اپنی پسند بناؤ!“

”جو آپ کی پسند وہ میری پسند!“

مجھے اس پر بے حد پیارا آیا۔

”دیکھو بیٹے! مسئلہ یہ ہے کہ تم مجھے اتنے عزیز اتنے پیارے ہو کہ کوئی لڑکی مجھے ایسی نظر ہی نہیں آتی جسے میں تمہارا ہم سفر بنا سکوں۔ میں تو نجانے کیا چاہتی ہوں۔ تمہارے حوالے سے میرا معیار کچھ زیادہ ہی بلند ہو گیا ہے۔ اب تم ہی میرا مسئلہ حل کر سکتے ہو۔ کوئی اشارہ تو دو۔“

”امی!.....!“ وہ کچھ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”آپ کو یاد ہے نانی امی کی پڑوس میں ایک ڈاکٹر صاحب تھے..... ان کی ایک بیٹی تھی..... نیرہ احمد..... میں جس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔ جو میری کلاس میٹ بھی تھی۔“

وہ رک رک کر کہہ رہا تھا۔ مجھے یاد آ گیا۔ وہ بچی بے حد پیاری تھی۔ کبھی امی کے گھر آ جاتی تو سب اسے روک روک کر چوما کرتے تھے۔ شہابی رنگت ستارہ آنکھوں والی وہ بچی مجھے بخوبی یاد تھی۔ مگر دیکھ بچپن میں اس سے بڑی دوست تھی۔

”ہاں۔ مجھے یاد ہے۔“ میں خواب کے سے عالم میں ہوئی۔

”نیرہ سے میری پچھلے سال ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بالکل دیسی کی دیسی ہے امی..... میرا مطلب ہے اتنی ہی..... میں نے ایک مرتبہ سوچا تھا کہ آپ سے اس کا ذکر کروں لیکن پھر میں نے سوچا کہیں میری بات سے آپ کو دیکھ نہ پہنچے لیکن اب آپ نے خود پوچھا ہے تو.....“

”تو تم نے بات اگلی دی۔“ میں نے پیار سے اسے دیکھا۔ ”ورنہ دل کی دل میں ہی

رہتا میرا اگلا بیٹا! میں نیرہ کے گھر جانے کے لئے بے تاب ہو گئی۔ بھلا ایسا ممکن تھا کہ میرا عماد کسی چیز کی خواہش کرتا اور میں اس کی خواہش کو پورا کرنے کے لئے بے تاب نہ ہوتی۔

میرا بس نہ چلتا تھا میں اسی لئے نیرہ احمد کو اپنے عماد کی دہن بنا کر لے آتی۔ کچھ وقت سرکا اور خدا نے میری یہ خواہش بھی پوری کر دی۔ میرے عماد کی چاندی دہن نیرہ احمد میرے گھر چلی آئی۔

دو واقعی چاندی پیاری تھی۔ شکل و صورت تو بھلی تھی ہی طبیعت کی بھی سلجھی ہوئی بچی تھی۔ زندگی کی گاڑی پھر سے رواں ہو گئی۔ عماد کو بہت اچھی سی نوکری ملی تو اس کے اسرار پر میں نے استغنیٰ دے دیا۔

اب میں اور نیرہ گھر رہ رہا کرتے تھے۔ اس دن عماد گھر آیا تو بہت خوش تھا۔ دروازہ میں نے کھولا تھا۔ وہ مجھے سلام کر کے اندر چلا گیا۔ نیرہ کچن میں تھی۔ وہ سیدھا کچن میں چلا گیا۔ میں اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی جب مجھے ان دونوں کے بننے کی آواز آئی۔

ایک لمحے کے لئے میرے قدم تھمے پھر میں لاؤنج سے اپنے کمرے میں آ گئی۔ نجانے کیوں مجھے غم آ گیا تھا۔ وہ عماد جو گھر آ کر میرے آگے پیچھے پر دانوں کی طرح پھرتا تھا۔ وہ محض ایک لفظ بول کر مجھے نظر انداز کرتا نظر نہیں آتا۔ اسے جہہ بعد آٹھ دن پہلے آئی ہوئی بیوی اس قدر عزیز ہو گئی تھی کہ اسے اپنی ماں کی خیریت دریافت کرنا بھی یاد نہ رہا۔

میں بیڈ پر بیٹھ کر ایک افسردگی کے عالم میں سوچے جا رہی تھی جب وہ اجازت لے کر اندر چلا آیا۔

”کیا سوچ رہی ہے میری ماں؟“ وہ میرے پاؤں تمام کر بیٹھ گیا۔

”کچھ نہیں۔ آؤ بیٹھو!“ میں نے پیر سمیٹ کر خود پر قابو پایا۔

”ای۔ میں نے آفس سے ہفتے بھر کی چٹھی لی ہے۔ دراصل میں اور نیرہ گھونٹے جا رہے ہیں۔“ وہ بڑے خوشگوار دڈ میں بتا رہا تھا۔

میں ایک سکتے کے عالم میں رہ گئی۔ یہ وہی عماد تھا جو مجھ سے اجازت لئے بنا پڑوس میں بھی نہیں جاتا تھا اور وہ کتنے مزے سے مجھے ہفتہ بھر کے لئے جانے کا مڑدو سنا رہا

تھا۔ اس نے یا نیرہ نے مجھ سے پوچھنے کی ضرورت محسوس ہی نہ کی تھی۔ ابھی میں کچھ کہنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ نیرہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی زرے تھی۔ ساتھ وہ سمو سے تل کر لائی تھی۔

میں نے واضح طور پر محسوس کیا۔ اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نناد کی پوری توجہ اس کی جانب مرکوز ہو گئی تھی۔ اس نے نیرہ کے لئے کھسک کر جگہ بنائی اور وہ اس سے جڑ کر بیٹھ گئی اب وہ مسلسل اسے جانے کے پروگرام کے متعلق بتا رہا تھا۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے مسکرا رہے تھے۔ منظر میں سب سے غیر اہم شے شاید میری ذات تھی۔

”ای! یہ سمو سے لیں نا۔“ اچانک ہی نیرہ کی توجہ میری جانب ہوئی۔ ”ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔“

”مجھے سمو سے پسند نہیں۔“ نجانے کیوں میرا لہجہ خشک ہو گیا۔ ”اور عماد تو بالکل نہیں کھاتا۔ تمہیں بنانے سے پہلے پوچھ لینا چاہئے تھا۔“

نیرہ کا چہرہ سفید ہوا۔ وہ میرے غیر متوقع جواب سے الجھ ہو گئی تھی۔

عماد نے جلدی سے سمو سہ اٹھالیا۔

”ارے ای! آپ کو نہیں پتا۔ میں تو کالج میں اتنے سمو سے کھاتا تھا کہ لڑکوں

نے میرا نام ہی مسٹر سہہ رکھ دیا تھا۔“

نیرہ کی ہنسی مہوٹ گئی۔ عماد بھی ہنسنے لگا۔ میں خون کے گھونٹ بھر کر رہ گئی۔ عماد نے زندگی میں پہلی مرتبہ میری بات کی نفی کی تھی۔

وہ دونوں گھونٹے گھونٹتے تھے تو میں اپنی ذات کے سوالات کے ساتھ تیار رہ گئی۔ مجھے ان دونوں کا یوں جانا بالکل اچھا نہ لگا تھا۔ کیا تھا جو وہ پہلے مجھ سے اجازت لیتے پھر پروگرام بناتے۔ کیا تھا جو وہ جہہ بعد آٹھ دن پہلے آئی ہوئی تھی۔ کیا میں اتنی ہی بے وقوف ہوں جو ان کے ساتھ چل دیتی؟

مجھے نیرہ کے خلاف اپنے دل میں پیدا ہونے والی کدورت کا احساس ہوا۔ مجھے

ایسا لگا کہ چوبیس برس تک میں نے جس باغ کی تیاری کا سامان کیا جب اس نے تیار ہو کر جنت کی سی صورت اختیار کی تو کسی نے ہاتھ پکڑ کر مجھے میری جنت سے نکال باہر کیا۔

میرے اندر دھواں سا بھرنے لگا۔ آگ بجڑک اٹھنے کا سامان ہونے لگا۔ وہ کل کی لڑکی میرے غما کو مجھ سے جدا کر کے لے گئی تھی۔ میرے غما نے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت تک نہ سمجھی تھی۔ وہ اوگ واپس لوٹنے تو اندرونی خوشیوں سے ان کے چہرے جگمگا رہے تھے۔ غما کو میں نے کبھی اس قدر خوش نہ دیکھا تھا۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگاتا تھا اور نیرہ۔ اس کے چہرے سے نکلا ہٹانا مشکل تھا۔ وہ حد درجہ حسین ہو گئی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کی ذات میں گم تھے۔

اور میں..... میں اپنی کیفیات سمجھنے سے یکسر قاصر تھی۔ میرا بیٹا میرا آتی جاتی سانوں کی واحد وجہ میرا غما خوش تھا اور میں اندر سے سلگ رہی تھی اور نیرہ جسے میں خود بڑی چاہتوں سے لے کر آئی تھی اس کے لئے میرے دل میں روایتی ماسوں والی نفرت پیدا ہو چکی تھی۔ مجھے وہ لڑکی نہایت بری لگنے لگی۔ اس نے میرے غما کو مجھ سے بے سوا کر دیا تھا۔ مجھے اس کا وجود ناگوار گزرنے لگا۔ یہ مگر میرا اور غما کا تھا۔ یہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے جیتے اور مرتے تھے۔ ہم دونوں کے خیالات محض ایک دوسرے کے لئے مخصوص تھے۔ ان خیالات میں کسی تیسرے فرد کا حصہ نہ تھا۔ اور اچانک ہی دو ہمارے درمیان آ کر نہ صرف حصہ دار بن گئی تھی۔ بلکہ اس نے تو مجھے میرے حصے سے ہی محروم کر دیا تھا۔

اب اس کے اور غما کے درمیان "میں" شاید کہیں نہ تھی۔

اب مجھے اس کی ہر بات قابل اعتراض نظر آنے لگی۔ غما آفس جاتا تو اس وقت نیرہ سو رہی ہوتی تھی۔ میں غما کو ناشتہ بنا کر دیتی تھی۔ میں نے اور غما دونوں نے ہی کبھی اس کے اس معمول پر اعتراض نہ کیا تھا۔ لیکن اب میں اس بات پر غصہ ہونے لگی۔

"تم نیرہ سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ تمہیں ناشتہ بنا کر دیا کرے؟" ایک صبح اس کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے میں نے کہا۔

"کیا فرق پڑتا ہے۔ امی؟" وہ مسکراتے ہوئے اخبار کے صفحات اٹھنے لگا۔ "وہ

نیرہ پوری کر لیتی ہے اور مجھے آپ کی باتھ کی بنی چائے مل جاتی ہے۔"

"تعریف تو سارا دن تم نیرہ کے باتھ کی بنی چائے کی کرتے ہو۔" میرا لہجہ معمول کے مطابق تھا۔ وہ میرا طنز نہ سمجھ سکا۔

"ارے اس کو تو میں کھینچ پالش کرتا ہوں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ "ورنہ آپ کے باتھ کا مزہ اس کے باتھ میں کہاں؟"

میں اندر تک شانت ہوئی۔ میرا بیٹا اب تک میرے کمانوں کا دیوانہ تھا۔ میں غما سے مزید کچھ نہ کہا لیکن نیرہ جب سو کر اٹھی تو میں نے اسے خاما طویل لٹکچر دیا۔

"ٹھیک ہے امی! جیسے آپ کہیں۔" اس نے محض اتنا کہا تھا۔

دوسرے دن سے وہ غما کو سو کر اٹھنے سے پیشتر ہی اٹھ کر باہر آ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس کے لئے ناشتہ بناتی۔ وہ آفس جانے لگتا تو اسے چھوڑنے نیچے سیرجیوں تک جاتی اور جب وہ واپس آتی تو اس کے لب مسکرا رہے ہوتے تھے۔

اس نے مجھ سے میری یہ خوشی بھی چھین لی۔ اب میرا بیٹا گھر سے نکلتے ہوئے مجھے نہیں اسے دیکھتا تھا۔ واپس آ کر تو خیر اسے نیرہ کے سوا کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔

سارا وقت وہ نیرہ کی تعریفیں کرتا رہتا تھا۔

"نیرہ! تم بڑے کمال کی لڑکی ہو! ارے یہ کام تم نے کتنا اچھا کیا ہے۔ فلاں وقت تم نے بہت اچھی بات کہی تھی۔ تم کو دل جیتنے کا ہنر کس نے سکھایا؟"

اس کے اکثر فقرے میرے کانوں میں پڑتے رہتے تھے۔ ہمارا فلیٹ دو کمروں پر مشتمل ایک مختصر سا گھر تھا اور پھر میرے کان اشوری طور پر ان کی باتوں کی طرف ہی گئے رہتے تھے۔ سو مجھے ان کی گفتگو سے اکثر واقفیت رہتی تھی۔

ان دنوں وہ مجھ سے بے حد نیاز ہو گیا تھا۔ سلام دنا کرتا تھا میرا مزاج بھی پوچھتا تھا، ہنس مذاق بھی کرتا تھا لیکن میں تو اس غما کا موازنہ ہمہ وقت اس غما سے کیا کرتی

تھی جو صرف میرا غما تھا۔ میں جس کی روح میں اتری ہوئی تھی۔ جو میری خدمت کو عبادت کہا کرتا تھا۔

میں زیادہ دن رو نہ سکی۔ ایک دن آفس سے آ کر مجھے سلام کرتا ہوا اپنے کمرے کی جانب جا رہا تھا جب میں نے اسے آواز دی۔

”جی ای؟“ وہ میری جانب بڑھ آیا۔

”یہاں آؤ غما!“

اسے میرا لہجہ تبدیل لگا۔ وہ نورانی اندر آ گیا۔

”جی ای؟“ کہیے؟“ وہ میرے قریب بیٹھ گیا۔

”تمہیں اب اتنی فرصت بھی نہیں میری آتی کہ دو گھنٹہ ہاں کے قریب بیٹھ جایا

کرد۔؟“ میرا شکوہ بالآخر لبوں پر آ ہی گیا۔

وہ شرمندہ ہو گیا میرے پیر دبانے لگا۔

”سوری امی! پچھلے پنجہ دنوں سے شاید میں آپ کو وہ پہلی سی توجہ نہیں دے پایا۔ خیر میں آئندہ خیال رکھوں گا۔ میری کوتاہی معاف کر دیں۔“

وہ گھنٹہ بھر میرے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہا۔ نیرہ کھانے کا پوچھنے آئی تو میں نے کھانا اپنے کمرے ہی میں منگوالیا۔ پھر چائے بھی ساتھ لی گئی۔

وہ دونوں انڈے کر گئے تو میں خاصی مطمئن تھی۔ میرے بیٹے کی برین واشنگ اتنی آسان نہ تھی۔ اس کی رگ رگ میں اس کی ماں کی کنکین ریاضت کی احسان مندی دوز رہی تھی۔ ایک تو کیا سوئیاں بھی اسے مجھ سے غافل نہ کر سکتی تھیں۔ غما اب محتاط ہو گیا تھا۔ وہ جان بوجہ کر نیرہ سے زیادہ مجھے توجہ دینے لگا۔ آفس جانے سے پہلے اور آنے کے بعد وہ نیرہ سے پہلے مجھے پوچھتا تھا۔ رات گئے تک وہ بیٹھا میرے پاؤں دباتا رہتا۔ مجھ سے زمانے بھر کی باتیں کرتا۔ میرا غما میری ذہنی سرزنش سے ہجرت میرا بن گیا تھا۔

میں اب خوشی تھی جہاں تک نیرہ کی بات تھی وہ اپنے جذبات کا اظہار نہ کرتی

تھیں۔ حالانکہ میں جانتی تھی کہ جب غما کی اس پر زیادہ توجہ مجھے اذیت دیتی ہے تو مجھ پر زیادہ وقت صرف کرنے سے نیرہ کے دل کو بخش دیتی ہوگی۔ بہر طور مجھے اس کی پروا تھی نہ اس کے دل کی۔

وقت کچھ اور سرکا اور بازی ایک مرتبہ پھر پلٹنے لگی۔ نیرہ ماں بننے والی تھی۔ غما کا بس نہ چلتا تھا وہ یہ خبر سن کر کیا کر ڈالے۔ وہ بے پناہ خوش تھا۔ نیرہ کی طبیعت خراب تھی وہ پورا بختہ آفس نہ گیا۔ سارا سارا دن وہ اس کے سر ہانے بیٹھا رہتا تھا کبھی اس کے لئے لیٹوں بناتا۔ کبھی گلو کوڑ گھوٹا، کبھی اسے حلیم الا کر کھلاتا بھی چنوں کی چاٹ۔

میں ایک مرتبہ پھر بس منظر بن گئی۔ نیرہ نے ایک بار پھر بازی جیت لی۔ اس موقع پر میں کچھ بھی نہ کر سکتی تھی۔ میں غما سے اس کی کم توجہ کی شکایت نہ بھی کر سکتی تھی۔

میں سارا۔ سارا دن اپنے کمرے میں پڑی رہتی اور غما اس کی دل جوئی میں لگا رہتا۔ میرے سر میں درد رہنے لگا۔ میرا بلڈ پریشر اکثر ہائی ہو جاتا تھا۔ لیکن غما کو فی الحال میری پروا نہ تھی۔ وہ نیرہ کے لئے ایسے فکر مند رہتا تھا جیسے وہ دنیا کی پہلی عورت تھی جو ایسے مسئلے کو فیس کر رہی ہو۔ ایک دن وہ حسب معمول آفس سے جلدی انڈے آیا تو میں چیخ مچی۔

”غما! تم آج پھر جلدی آ گئے؟“ میرا لہجہ تلخ تھا۔

”جی ای! نیرہ نے فون کیا تھا اس کا دل گھبرا رہا ہے۔“

”تم ریڈیو یا ٹی وی ہو جو اس کا دل بھانے چلے آئے؟“

”ای؟“ اسے میرے لہجے نے ہراساں کر دیا۔

”غما! یہ مرحلہ دنیا کی ہر عورت طے کرتی ہے۔ نیرہ کو احساس ہوتا چاہئے کہ وہ تمہاری پیشہ وارانہ ذمہ داریوں میں حائل ہو رہی ہے۔ تمہاری ترقی میں دیر ہو سکتی ہے بلکہ تمہیں نوکری سے جواب بھی مل سکتا ہے۔“

”ایسی بات نہیں ہے امی!“ وہ دبے دبے لہجے میں بولا۔

”بہر حال۔ مجھے یہ طریقہ پسند نہیں۔ تم نہ تو کوئی کھلونا ہو جو روز اس بچی کا جی

بہانے چلے آتے ہو اور نہ ہی کوئی دائی یا اکثر ہو جو اس کے "مرض" کی شدت میں کمی کر سکو۔ یہ وقت ہر عورت کو فیس کرنا ہی ہوتا ہے۔ مردوں کو ان باتوں کو اتنا سیریس نہیں لینا چاہئے۔

یہ ایک بھرپور ٹیگر تھا۔ جو اندر لپٹی نیرہ نے بھی سنا تھا۔ غماز چپ چاپ سر جھکائے اندر چلا گیا تھا اور کچھ دیر بعد تیار ہو کر گھر سے باہر۔ نیرہ پھر کمرے سے باہر نہ نکلی تھی۔

یہ مرحلہ بھی طے ہوا۔ وہ دونوں بے حد غماز ہو گئے۔ نیرہ چپ چاپ رہنے لگی تھی۔ اب اسے مکمل طور پر احساس ہو چکا تھا کہ میں غماز کے معاملے میں کتنی بچی ہوں۔ اب وہ دونوں میرے سامنے ایک دوسرے سے وہ پہلی سی لگاؤ کا مظاہرہ نہ کرتے تھے۔

عاشق پیدا ہوا تو کچھ عرصے کے لئے کے ہر قسم کی کشیدگی کا خاتمہ ہو گیا۔ غماز خوش تھا۔ نیرہ بے پناہ خوش تھی اور میں بھی خوش تھی۔ ہمارا گھر پھر سے وہی گھر بن گیا جہاں نیرہ نئی آئی تھی۔ عاشق کے آجانے سے جیسے وہ وقت پلٹ کر آ گیا تھا۔

نیرہ بیٹے کی ماں بن کر بے حد مصروف ہو گئی تھی۔ وہ عاشق کے کاموں میں سارا وقت صرف کر دیتی تھی۔ میں اس کو دیکھتی تو مجھے اپنا وقت یاد آ جاتا تھا۔ ناشق نئے غماز کا روپ دھار لیتا تھا۔

"نیرہ۔ جانتی ہو غماز بلکہ ایسا ہی تھا۔ کبھی کبھی مجھے بالکل ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غماز کا بچپن پھر سے لوٹ آیا ہے۔" ایک دن میں نے اسے بتایا

"آپ تو بہت چھوٹی سی ہوں گی امی۔" اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا۔

"ہاں۔ محض اکیس برس کی!" میری آنکھیں دھندلائیں۔

"آپ تو اب بھی تم سے زیادہ کی نہیں نکلتیں۔" وہ شرارت سے ہنسی۔ "جج جج

بتائیں امی۔! کوئی اچھا سا رشتہ آ جائے تو انکار تو نہ کریں گی؟"

"نیرہ۔" میں ایک دم پھٹ پڑی۔ "جہیں علم ہوتا چاہئے کہ تم کس سے کیا کہو۔

رہی ہو۔ بدتمیزی اور مذاق میں حد فاضل قائم رکھنا سیکھو۔ یا شاید تم مجھے اس گھر سے نکالنے کے طریقوں پر غور کرتی رہتی ہو؟"

اس کا منہ کھلا کا کھلا رو گیا۔ اسے شاید اتنے شدید رد عمل کی توقع نہ تھی لیکن میرے دماغ کی شریانوں میں خون کھول رہا تھا۔ میں نے اس بات کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ ایک طوفان اٹھا دیا۔ غماز آیا تو اسے بھی بے نقطہ سنائیں۔

نیرہ اور غماز نے مجھ سے خصوصی معافی مانگی۔ میری منتیں کیسے تب کہیں جا کر میرا غصہ ٹھنڈا ہوا۔ غماز نے بھی اس بات کا ٹوٹس لیا تھا۔ وہ کئی دن نیرہ سے ناراض رہا۔ نیرہ بالکل مرجھا کر رہ گئی تھی۔ اس نے تیار ہونا ہنسا بولنا بے حد کم کر دیا تھا۔ اب اس میں وہ پہلی سی چمک نہ رہی تھی، میں قدرے مطمئن تھی۔

بیوی زیادہ بچکے تو شہر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اسے دوسرے رشتے واضح نظر نہیں آتے۔

غماز کی توجہ اس پر کم ہوئی تو وہ میری توجہ کی زد میں آ گئی۔ اب میں اسے اس کی جگہ پر رکھنا چاہتی تھی۔ میں اسے زیادہ سے زیادہ گھر کے کاموں میں لگائے رکھتی۔ اپنا کمرہ بار بار صاف کر داتی۔ اپنے کپڑے دو دو مرتبہ دھو داتی۔

شاید میں لاشعوری طور پر اس سے پیچھے دنوں کا حساب مانگ رہی تھی۔ وہ ایک آدھ بار جھنجھلائی تو میں نے غماز سے اس کی بدتمیزی کی شکایت کی۔ غماز آج بھی میری بات چلنا گمانہ جانتا تھا۔

ایک دن غماز کے جانے کے بعد نیرہ نے ناشق کو سلا یا اور میرے کمرے میں چلی آئی۔ "امی! مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے۔" اس کے انداز غیر معمولی تھے۔

"جلدی کیو۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔" میرا لہجہ حسب معمول خشک تھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ میں اور غماز اس گھر میں شفٹ ہو جائیں جو غماز کو کپنی والے دے رہے ہیں۔"

میرا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رو گیا۔

"کیا مطلب؟ اور میرا کیا ہو گا؟"

”ہم روز آپ سے ملنے آئیں گے۔“

”نما دراضی ہے؟“

”وہ آپ کی مرضی کے پابند ہیں۔“

”پھر؟“ مجھ سے کیا چاہتی ہو؟“ میں خوش ہو گئی۔

”آپ نماز کو اجازت دیں۔ بخوشی!“

”تم اپنا بیٹا میرے مائیکے سے مجھے دو گئی؟“

وہ خاموش ہو کر لب کاٹنے لگی۔

”میرے بیٹے پر آپ کا اتنا حق نہیں کہ آپ مجھ سے اسے مائیکے میں آپ کے

بیٹے کی بیوی ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولی تھی۔

”بیوی اور ماں کے حقوق کا موازنہ کیا ہے کبھی؟“ میں نے نخوت سے اسے دیکھا۔

”نہیں۔ کبھی نہیں کیا۔ میں محض ایک بیوی کے حقوق کا مطالبہ کرتی رہی ہوں اور

جو کچھ چاہتی ہوں وہ میرا جائز حق ہے۔“

”کیا چاہتی ہو؟ ایک ماں سے اس کا بیٹا جدا کرنا چاہتی ہو؟“

”نہیں۔ اپنے لئے ایک علیحدہ گھر چاہتی ہوں۔ جہاں میرے لئے دہنی سکون ہو“

جہاں میری مرضی کے مطابق جی سکوں۔ جہاں میرا شوہر مجھ سے ویسی ہی محبت کرنے

جیسی وہ کرنا چاہتا ہو۔“

وہ ہر روز دہن نہیں ہے۔“ میں نے بے نیازی سے منہ پھیر لیا۔

”آپ کو بخوشی اجازت دینی چاہئے امی! ورنہ آپ کو دلی تکلیف ہوگی۔“

”نہ مجھے چیلنج کر رہی ہو؟ تم عمامہ کو مجھ سے کسی طور جدا نہیں کر سکتیں۔ کوشش کر دیکھو۔“

وہ مجھے ایک گہری نظر سے دیکھ کر مڑ گئی۔

عمامہ آیا تو میں نے اسے آواز دے کر پہلے اپنے پاس بلوالیا۔

”تمہیں کپنی گھر دے رہی ہے؟ میں نے بتا کسی تمہید کے پوچھا تھا۔“

”جی...؟“ وہ چور سا بن گیا۔ ”جی امی۔“

”تم مجھے تنہا چھوڑ کر چانا چاہتے ہو؟“ اس لئے میرے لہجے میں بے یقینی بولنے لگی۔

”نہیں امی!“ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا پھر پست آواز میں بولا۔ ”اگر آپ

نہیں چاہیں گی تو کبھی نہیں۔“

”ہوں!“ میں مطمئن ہو گئی۔ ”جاسکتے ہو۔“

میں بے حد پرسکون ہو گئی تھی۔ محبت کی جس دُور سے میں نے اپنے بیٹے کے دل

کو باندھا تھا وہ اتنی کمزور تو نہ تھی کہ یوں ٹوٹ جاتی۔ ماں بیٹے کا رشتہ انوٹ ہے۔ میاں

بیوی کا رشتہ دنیا کا سب سے کمزور رشتہ ہے۔

شام کو نیرہ اپنا بیگ اور ناشتر کو لے کر گھر سے چلی گئی۔ شاید عمامہ نے اس پر اپنا

نقطہ نگاہ نظر واضح کر دیا تھا۔

میں بے پناہ خوش ہوئی۔ کھیل میں جیت میری ہوئی تھی۔ نیرہ کبھی تھی کہ اس کی

دو روزہ محبت اور خدمت میری پچیس سالہ ریاضت پر غالب آ جائے گی۔ ایسا ناممکن تھا۔ نیرہ

کو مجھے مہینہ دو مہینے اور پھر چھ ماہ گزر گئے۔ عمامہ ایک عجب کشکاش کا شکار تھا۔ نیرہ اس گھر میں

واپس آنے کے لئے تیار نہ تھی۔ میں کسی طور پر اسے علیحدہ ہونے کی اجازت نہ دے سکتی

تھی۔ میں نے اپنے بیٹے کو اس کشکاش سے باہر نکالنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک روز میں نے اس

سے بات کی۔

”عمامہ! جانتے ہو ایک ماں کا قرض کیا ہوتا ہے؟“ وہ بیڈ پر لیٹنا چیت کو گھور رہا تھا۔

”جانتے ہو عمامہ! تمہاری خاطر میں نے زندگی کس طرح گزاری ہے؟“

”جی امی! جانتا ہوں۔“

”جیسے کوئی جوگ لے کر بھری دنیا چھوڑ دے۔ کسی محراب میں جا بیٹے۔“

”میرا روال آپ کا مقروض ہے امی!“

”اگر میں تم سے کچھ مانگوں تو؟“

”ماٹک کر دیکھیں۔ جان سے زیادہ تو نہیں مانگی گی؟“ وہ پشیمانی مسکراہٹ کے

ساتھ بولا۔

”نیرہ کو طلاق دے دو۔“

”کیا؟“

وہ اچھل کر بیٹھ گیا اور بڑی بے یقینی سے میرا چہرہ دیکھتا رہا۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں نے اس سے اس کی جان سے بڑھ کر کچھ طلب کیا ہے۔

”میں چاہتی ہوں غماز! تم ایک خوشی سے بھرپور مطمئن زندگی گزارو۔ نیرہ وہ لڑکی نہیں جو تمہیں ایسی زندگی دے سکے۔ ماں اپنے بیٹے کے لئے غلط نہیں چاہے گی۔ مجھ پر بھروسہ کر کے اسے طلاق دے دو۔ میری دعاؤں سے تمہاری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔ دنیا میں اچھی لڑکیوں کی کمی نہیں ہے۔ یہی میری خواہش بھی ہے اور میرا حکم بھی۔“

میں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل آئی۔

چند روز بعد وہ نونا نونا، کھرا کھرا میرے پاس آیا تھا۔

”ای۔ میں نے نیرہ کو طلاق بھیج دی ہے۔“

زندگی میں بہت بڑی تبدیلی آئی تھی لیکن سب کچھ پہلے جیسا نہ ہو سکا۔ میں نے غماز کی دوسری شادی کی کوشش کی تو اس نے ہاتھ جوڑ کر مجھ سے درخواست کی کہ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتا لیکن میرا غماز اندر سے بدل گیا تھا۔ اس کی تمام خوشی، شوخی، شرارت رخصت ہو گئی تھی۔ میں نے ایک دو مرتبہ عاشق کو لے آئے کی بات کی تو اس نے انکار کر دیا۔

”دو ماں سے بچھڑ کر بیمار ہو جائے گا امی۔ پلیز!“

میں بھی اتنی بہت نہ کر سکی کہ ایک ماں سے زبردستی اس کا بچہ چھین لوں۔

پھر ایک دن غماز نے مجھے بتایا کہ وہ دو سالہ کودس کے لئے باہر جا رہا ہے۔

”کمپنی نے اس مقصد کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔ میرے کیریئر کا سوال ہے

ای۔ امید ہے آپ مجھے نہیں روکیں گی۔“

اس نے خبر سنا کر مجھ سے کہا تھا اور اس بات کے بعد اسے روکنا بے سود تھا۔ اس کا کیریئر غماز پر دیکھنا تو میری اپنی بہت بڑی خواہش تھی۔

”دو سال کی تو بات ہے۔“ میں نے خود کو سمجھایا تھا۔ ”زندگی پلک جھپکتے گزر گئی ہے۔ بھلا چند ماہ دو سال کیا معنی رکھتے ہیں؟“

غماز چلا گیا۔ میں تنہا رہ گئی۔ شاید تنہائی ازل سے میرا مقدر قرار پائی تھی۔ میں اس کے پلٹ آنے کا انتظار کرتی رہی۔ وہ نہیں آیا۔

دو سال گزرے۔ پھر چار اور پھر چھ سال گزر گئے۔ غماز کے خطوط آتے تھے۔ اس نے وہاں شادی کر لی تھی۔ اس کی بیوی یہاں آنے پر تیار نہ تھی لیکن غماز کو امید تھی کہ کبھی نہ کبھی وہ راضی ہو جائے گی۔ تب تک کے لئے اس نے مجھے اچھی امیدوں کے تحفے بھیجے تھے۔

میں جانتی تھی میرا غماز اندر سے ٹوٹ گیا تھا۔ وہ مجھ سے خفا ہو گیا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ کی جہاننی بخش دی تھی۔

میں بالکل تنہا رہ گئی۔ زندگی میں کوئی مقصد نہ رہا تھا۔ میں نے ایک اسکول کھول لیا۔ ذہن قدر سے بٹ گیا لیکن اکثر تنہائی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کرتی تھی۔

تب ایک روز ڈاک سے مجھے نیرہ کا خط موصول ہوا۔ وہ خط ایک نئی زندگی کی نوید تھی۔ اس لکھا تھا۔

امی جان

السلام علیکم

امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ خدا سے آپ کی خیریت اور لمبی عمر کی دعا مانگتی ہوں۔

غماز نے طلاق دینے سے قبل مجھ سے پوچھا تھا کہ میں اسے ایک دوست کی حیثیت سے درست مشورہ دوں کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟

میں نے کہا بیوی دنیا ہے اور ماں آخرت اور ایک مخلص دوست کبھی بھی آخرت کے مقابلے میں دنیا کا سوا دا کرنے کا مشورہ نہیں دے سکتا۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے مجھے طلاق دے دی۔ اس وقت مجھے

انسان بنا سکتی ہیں۔ غماد کو میں نے ایسا ہی پایا تھا۔

جہاں تک عاشق کے مستقبل کا سوال ہے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ اب آپ کبھی بھی اپنی غلطی دہرانے کی ہمت نہیں کریں گی۔ غماد کے بعد عاشق کو کھونا آپ کے لئے ناممکن ہو گا۔ عاشق گیارہ برس کا ہے۔ عام بچوں سے بالکل مختلف بہت ذہین اور سنجیدہ طبیعت کا مالک ہے۔ شاید وقت اور حالات نے اسے ایسا بنایا ہے۔ یہ آپ کے پاس آنے اور آپ کے ساتھ رہنے پر دل سے راضی ہے ورنہ میں اکیلے یہ فیصلہ کبھی نہ کر پاتی۔

شاید اس کے دل میں بھی کہیں یہ امید پوشیدہ ہے کہ اس طرح یہ اپنے باپ سے کبھی مل پائے گا۔

میرا دل آپ کی جانب سے صاف ہے۔ یقیناً آپ بھی میری کوتاہیوں پر مجھے معاف کر چکی ہوں گی۔ عاشق کل صبح دس بجے آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ میرے عاشق کو اپنے غماد جیسا بنائیے گا۔

نقطہ

نیر و احمد

میرے آنسو میرے رخسار بھگور رہے تھے۔ میں نے کتنی ہی بار اس تحریر کو پڑھا اور پھر چوم کر اپنے سر ہانے رکھ دیا۔

اگلی صبح میں بہت سویرے بیدار ہوئی تھی۔ نماز پڑھ کر میں کچن میں چلی آئی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے عاشق کو وہ سب چیزیں بہت پسند ہوں گی جو میرا غماد شوق سے کھاتا تھا۔

”میرا بیٹا میرا لال ...“ میں کام کرتے ہوئے بڑا بڑا رہی تھی۔ ”میں تجھے بڑی محبتوں سے پالوں گی۔ تیرے لئے اپنی زندگی وقف کر دوں گی۔ تو بہت بڑا آدمی بنے گا پھر میں تیرے لئے چاند سی دلہن لاؤں گی۔“



آپ سے بے پناہ شکوہ تھا۔ آپ کے خلاف میرے دل میں حد درجہ کدورت تھی۔ لیکن امی جان! مجھے اعتراف ہے کہ جیسے جیسے وقت گزرا میرے دل سے سارے شکوے جاتے رہے۔ ہر طرح کی کدورت مٹنے لگی۔ سارے غبار مٹنے لگے۔ کیونکہ میں ایک ماں ہوں اور زندگی اسی طور گزار رہی ہوں جیسے کبھی آپ نے نزاری تھی۔

امی جان! آپ کے جذبات اور احساسات کسی الہام کی مانند میرے اوپر نازل ہو رہے ہیں۔ کبھی میں تصور کی آنکھ سے پچھلے مناظر دیکھتی ہوں تو خود کو آپ کی جگہ اور عاشق کو غماد کی جگہ پاتی ہوں۔ لیکن ایک اعتراف میں اور کرتی ہوں۔ میں کبھی بھی بلقیس بیگم بن کر کسی نیرہ کی زندگی تباہ کرنا نہیں چاہوں گی۔ ہر چند کہ مجھے عاشق سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ آپ نے غماد سے کی۔

خدا نے ماں کا حق ہر دوسرے شخص کے حق میں زیادہ رکھا ہے۔ لیکن انسوس اس بات کا ہے کہ ہمیں اس حق کا احساس اولاد بن کر نہیں خود ماں بن کر ہوتا ہے۔ ایک ماں اپنی اولاد کے لئے دن رات ریاضت کرتی ہے اپنی ہستی خاک کر ڈالتی ہے خواہشات فنا کر دیتی ہے اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ خدا کے دیے حق سے ناجائز فائدے اٹھانا چاہتی ہے۔ اپنی قربانیوں کا خراج مانگتی ہے۔ گزشتہ محبت کو حالیہ انا میں تبدیل کر کے اپنی ہی اولاد کی خوشیاں تباہ کر دیتی ہے۔

مجھے اس وقت سے خوف آتا ہے جب میں عاشق سے اپنی ریاضتوں کا صلہ طلب کروں۔ میں نفسیاتی مریض بن رہی ہوں۔ یہ خوف میری ہستی کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا ہے۔ لیکن میں اس خواہش سے بچنے کا راز حاصل نہیں کر پاتی کہ عاشق دنیا میں سب سے زیادہ مجھے چاہے۔ میرا مان کرے۔

اسی لئے امی جان میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میں دوسری شادی کر رہی ہوں۔ ایک ایسے شخص سے جس کے تین بچے ہیں اور مزید بچوں کی اسے خواہش نہیں ہے۔

عاشق کو ... میں آپ کے پاس بھیج رہی ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ آپ اس کی بہترین طریقے پر پرورش کر سکتی ہیں۔ اسے بہترین تربیت سے آراستہ کر کے ایک بہترین

جنت دوزخ

”اور جس بندے نے دنیا میں سکھ ہی سکھ دیکھے ہوں گے اور ان نعمتوں پر خدا کا شکر بجا لایا ہو گا اسے خدا بالوں سے پکڑ کر دوزخ میں ایک غوطہ دے گا پھر نکال کر پوچھے گا کہ ”اے ابن آدم! بتا تو نے کبھی کوئی سکھ یا آرام پایا؟“ وہ کہے گا ”اے پروردگار! کبھی نہیں..... ہمیشہ سے اسی مصیبت اور پریشانی میں مبتلا ہوں“

نیمہ نے چھری میز پر رکھی اور ماتھے پر آیا لہجہ ذہن کے پلو سے پوچھنے لگی۔ گرمی سے دم نکلا جا رہا تھا۔ پلازا کی لائٹ پچھلے تین گھنٹے سے غائب تھی۔ دوپہر کا ایک بج رہا تھا۔ مسجدوں میں جمعہ کا خطبہ ہو رہا تھا۔ جن علاقوں میں لائٹ موجود تھی وہاں کی ایک مسجد سے خطبہ پڑھتے مولوی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

نیمہ نے سر پر پاؤ بھر مہندی تھوپ لی، دوٹی تھی اور اب خود کو کوس رہی تھی کہ مہندی لگانے کے لئے جمعہ کا مبارک دن ہی رو گیا تھا؟

”اور جس بندے نے دنیا میں رنج پریشانی اور دکھوں کا مقابلہ کیا ہو گا“ اسے اس کا پروردگار جنت میں ایک غوطہ دے گا اور پھر پوچھے گا۔ ”اے میرے بندے! بتا کبھی تو کسی مصیبت میں مبتلا ہوا؟“ وہ کہے گا ”نہیں میرے پروردگار! ہمیشہ سے اپنی آسائشوں میں ہوں۔ کبھی کوئی دکھ چھو کر بھی نہیں گزرا۔“ ”میری کم بختی!“ اس نے خود پر دانت پیسے ”مہندی نہ لگائی ہوئی تو کپڑے بدل کہ جمعہ کی نماز تو پڑھ لیتی۔ اب نبھانے کس وقت لائٹ آئے“ سب پانی ٹینک میں چڑھے تو کب میں نہاؤں گی۔ جمعہ کے دن کی رمت سے بھی محروم رہی۔ خدا ان بجلی والوں سے کہئے۔ اتنا اتنا بل وصول کر بھی ان کے پیٹ

نہیں بھرتے۔ کھوئی نیوٹن کا کھونا پھل سدا ان کے کھبوں میں خرابی ہی رہتی ہے۔
بھنگان ہم غریب بھٹکتے ہیں۔“

وہ دوپہر کے کھانے کے لئے سبزی تیار کر رہی تھی۔ تینوں بچے چھوٹی چھوٹی نیکریں پہن کر گھر بھر میں ادھم مچا رہے تھے۔ گرمی اس قدر تھی کہ دیواریں بھاپ اٹھتی محسوس ہوتی تھیں۔ نیمہ نے بچوں کو اسکول سے لوٹنے پر انہیں محض نیکریں ہی پہنا دی تھیں۔ اس امید پر کہ لائٹ آنے پر نہا کر کپڑے پہنائے گی۔ خود اس نے صبح اٹھتے ہی رات بکھول کر رکھی ہوئی مہندی بالوں میں لگائی تھی۔ اب گرمی کی شدت سے مہندی کا پانی بہہ بہہ کر اس کا چہرہ بھی گل و گلزار کر رہا تھا۔ کائن کی قمیض پہنے کی زیادتی سے گیلی ہو رہی تھی۔ گرمی کی وجہ سے اس کا کام کرنے کو بھی جی نہ چاہتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک نہ اس نے نمیک طرح سے گھر صاف کیا تھا نہ ہی کچن میں بجالی کی کوئی صورت تھی۔ لائٹ نہیں تھی تو پانی بھی نہیں تھا صبح کے چھوٹے برتن یونہی سک میں بھرے ہوئے تھے جن پر بھجھکتا ہوئی کھیاں اب اکٹا کر اندر کمرہ کا رخ کر رہی تھیں۔ چولہے گندے ہو رہے تھے اور ان میں ماچس کی جلی ہوئی تیلیاں کا ذہیر تھا کڑوا داغ دھبوں سے اُٹنے ہوئے تھے۔

نیمہ نے سبزی تو کاٹ لی تھی لیکن اب اسے پکانے کے لئے کچن میں گھسنے کا جی نہ کرتا تھا۔ کچن گندا تھا اور کیموں کے غول کے غول دباں دھوٹ شیراز اڑانے میں مشغول تھے۔ اس پر گرمی کی شدت سے بے حال ہوتی سانسیں۔

نیمہ جی بھر کر۔ ای۔ ایس۔ سی والوں کو کوئی رہی۔ بچوں کو اب بھوک ستانے لگی تھی۔ وہ بہانے سے آپس میں لڑ جھگڑا کر رہے تھے۔

”ارے یہ دنیا کے دھندے تو ہمیں رہ جائیں گے لوگو۔ ملک الموت سامنے آ کھڑا ہو تو تم اپنے بچوں کو بھی بھول بھال کر اس کے ساتھ چل دو گے۔ پھر بتاؤ کیا لے جاؤ گے اپنے ساتھ؟ اولاد؟ دولت؟ یہ دنیا ہی مصروفیت؟ جو ساتھ لے کر جاؤ گے اس کی تیاری کر دو لوگو۔“

نیمہ جڑ بڑ ہوئی۔ مولوی تو سیدھا اسی کو جتا رہا تھا۔ اس نے بے حد بے زاری سے اپنے چھوٹے سے نایت پر بھر پور نگاہ دوڑائی۔ یہاں سے وہاں تک سب کچھ الٹا تھا۔ کچھ بھی

ایسا نہ تھا جو نظر اور دل کو تسلی دیتا۔

”ایسا مبارک دن اور ایسی نعمت کے ساتھ گزارا جائے!“ اس نے پیشانی پر ہاتھ مارا ”صبح سے لائنٹ کی آس میں بیٹھی رہی۔ کچھ ذکر اذکار ہی کر لیتی۔ ہائے نیمہ! تیرا کیا بنے گا؟ کیا لے جائے گی اپنے ساتھ؟“

پھر وہ بہت ہمت کر کے انھی اور کچن میں جا گھسی..... بجلی اور پانی نہ تھے۔ غنیمت تھا کہ گیس آ رہی تھی۔ اس نے کونے میں دھڑے بڑے سے کین سے پانی نکالا اور چٹیلی مانجنے لگی۔ گھر چھوٹا تھا اور کچن بہت چھوٹا۔ ضرورت کے چند برتن رکھنے کی گنجائش تھی ہر بار انہیں دھو کر کام چاٹنا پڑتا تھا۔ نیمہ نے چٹیلی دھو کر چولہے پر رکھی اور سبزی پکانے لگی۔

”اے.....“ سب سے چھوٹا والا آنسوؤں سے چہرہ بھرے اس کی مانگوں سے آلیٹا ”ای..... کھانا دو اب مجھے بھوک لگی ہے۔“

”اچھا میرے چاند..... بس ابھی دیتی ہوں.....“ نیمہ نے اسے چکارا۔

”میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے.....“ وہ چلایا

نیمہ نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا پھر ایک شیلف سے بسکٹ کا ڈبہ نکال کر اسے تھما دیا ”لو یہ کھاؤ میں ذرا سی دیر میں کھانا دیتی ہوں.....“

بچہ بسکٹ پا کر اچھمتا ہوا باہر چلا گیا۔ نیمہ نے دوسرے چولہے پر توار رکھ دیا اور ساتھ ہی ساتھ روٹیاں بھی پکانے لگی۔ اس کے کانوں میں خلبے کے الفاظ گونج رہے تھے۔ اسے خود پر اور ہر چیز پر غصہ آ رہا تھا۔ اس وقت اسے جاہ نماز پر دونا چاہئے تھا۔

”کیا لے جاؤ گے اپنے ساتھ؟ اولاد؟ دولت؟ دنیاوی مصروفیت؟“

وہ تاسف میں گھری۔ دینی اور سائن ساتھ ساتھ تیار کرتی رہی۔ آدھے گھنٹے میں اس نے کھانا تیار کر لیا تھا۔ کچن سے باہر پڑی چھٹی سی گول میز پر کھانا رکھ کر اس نے بچوں کو آواز لگائی۔ وہ تینوں بھوک سے بے تاب ہو رہے تھے۔ اچھلتے کودتے چلے آئے۔ ابھی نیمہ ان کی پٹنیوں میں سائن ڈال ہی رہی تھی کہ بجلی آ گئی۔

بچوں نے خوشی سے نعرے بلند کئے۔ نیمہ کے لبوں پر خوشی سے بھرپور مسکان دوڑ گئی۔ اس نے با آواز بلند خدا کا شکر ادا کیا اور پتکے چا دیئے۔ بچے کھانا کھانے میں مشغول

ہو گئے۔ نیمہ بکھرا ہوا گھر سیٹھنے لگی۔ دو چھوٹے چھوٹے بندروں اور ایک ڈرائنگ ڈائننگ..... اسے زیادہ دیر نہ لگی جب تک بچوں نے کھانا کھایا وہ گھر کی اشیاء قرینے سے جگہوں پر پہنچا چکی تھی۔ جھاڑو بچہ نچھاتو کام والی ماسی صبح ہی کر گئی تھی۔

مسجدوں میں اب نماز کے بعد درود و سلام ہو رہا تھا۔ نیمہ نے ٹل کھول کر چیک کیا۔ پانی بھی آ رہا تھا۔ جی ہی میں شکر بجالاتے ہوئے اس نے بچوں کو ہاتھ روم میں دھکیلا اور خود کچن میں چلی آئی۔ جلدی جلدی برتن دھو کر جگہوں پر رکھے کاؤنٹر اور چولہے صاف کئے اور فرش پر دا پھر پھیر کر باہر نکل آئی۔ ننگ دھڑنگ بچے نہا کر باہر آچکے تھے۔ اور صوفوں پر اچھل رہے تھے۔

”کم بختو.....“ اس نے سب کو ایک ایک جھانپڑ رسید کیا ”ابھی گھر سینا ہے میں نے.....“ تم پھر حشر نشر کر دو..... چلو کپڑے پہن کر لیٹو تھوڑی دیر کے لئے.....“

بچوں کو لباس پہنا کر اس نے ان کو بند روم میں بند کیا اور خود اپنا ایک جوتا نکال کر نہانے کے لئے کھس گئی۔ بالوں سے مہندی صاف کرتے کرتے اسے نہانے میں ہی غاسی دیر لگ گئی تھی۔

نہا دھو کر ہاتھ روم صاف ستھرا کر کے جب وہ برآمد ہوئی تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کیلے بال جھٹکتے ہوئے اس نے ذرا کی ذرا بچوں کے کمرے میں جھانکا۔ وہ تینوں بستر پر آڑے تر جتھے لیٹے بے خبر سو رہے تھے۔

نیمہ کے جی کو مکمل تسلی اور بھرپور سکون اور فراغت کا احساس ہوا۔ صبح سے جس ذہنی تحکک اور غیبی ٹینشن سے نبرد آزما تھی اس سے گلو خلاسی ہوئی۔ اسے بھوک کا احساس ہوا۔ گھر میں پھیلی ہوئی کھانے کی خوشبو اسے اب محسوس ہونے لگی تھی۔

وہ کچن میں پہن آئی۔ صاف ستھرا کچن اس کی نگاہ کو ڈھیر سکون بخش گیا اس نے اپنے لئے کھاٹ نکالا اور باہر پڑی میز پر آ بیٹھی۔

گھر اب ”گھر“ لگ رہا تھا۔ پتکے چل جانے پر گرمی اپنے پر سیٹ کر بالکونیوں میں جانگلی تھی۔ گھر میں ٹھنڈک سکون اور شانتی کا راج تھا۔

نیمہ نے کھانا کھا کر ایک مطمئن ڈکار لی۔ پھر وہ انھی اور چھوٹے برتن کچن میں

رکھ کر کمرے میں چلی آئی۔ اے۔ سی آن کر کے وہ کچھ دیر کے لئے بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کا وجود ڈھیلا ڈھیلا اور بے جان سا ہونے لگا تھا۔ بالوں سے مہندی نکل گئی تھی تو ذہن کو ہلکا پن محسوس ہو رہا تھا۔ اسے خنودگی نے آن گھیرا۔ اس نے ایک نگاہ تین بجاتی گھڑی پر ڈالی۔ ظہر کی نماز کے لئے ابھی کافی وقت پڑا تھا۔ اس کے بعد وہ عصر تک ذکر اذکار بھی کر سکتی تھی۔ عصر کے وقت اسے بچوں کو جگا کر سپارہ پڑھنے کے لئے مسجد بھی بھیجنا تھا جہاں مولانا صاحب عصر کی نماز کے بعد بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔

نیمہ نے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ اے۔ سی کی کولنگ سے کمرہ ٹھنڈا ہو کر جنت کا سا مزہ دے رہا تھا۔ پردوں سے چمختی ہوئی ہلکی ہلکی روشنی سے ماحول بے حد پرسکون اور خوابناک لگ رہا تھا۔ گلدان میں سجے نعلی پھول پتے کی ہوا سے ایسی مانوس سرسراہٹ پیدا کر رہے تھے جو نیند لانے میں بے حد معاون و مددگار ثابت ہوتی ہے۔

نیمہ کو نماز یاد آئی۔ پھر اس کی آنکھوں کا بوجھل پن بڑھنے لگا۔ دو گھنٹے بعد اسے بچوں کو جگا کر مدرسہ بھیجنا تھا۔ دن بھر کی کوفت کے بعد آرام کے لئے اس کے پاس محض دو گھنٹے تھے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کمرے میں جلتا ہوا ایسپ گل کر دیا اور کروٹ لے کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے مدہوش ہوتے ہوئے ذہن میں دور کہیں مولوی کی آواز گونج رہی تھی۔

”اور بندہ کہے گا۔“ نہیں میرے پروردگار! ہمیشہ سے اپنی آسائشوں میں ہوں!“



خدمت

اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے کمرے کا ذرا ذرا سا جائزہ لیا پھر خود کو مکمل طور پر تنہا پا کر سکون کا گہرا سانس لے کر 'گاؤ' کیے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے بیٹھ گئی۔ رگ دپے میں گویا سکھ اور شانتی کا سمندر رواں تھا۔ خوشی اور فراغت کا احساس ایسا زور آور تھا کہ آنکھیں سوند کر لمبی تان کر سونے کا جی چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ پھیر کر بستر کی ملامت کو محسوس کیا۔ کمر پر زور ڈال کر تکیوں کے گداز کا اندازہ کیا۔ سر اٹھا کر بجی ہوئی خوبصورت چہست ملاحظہ کی۔ اپنے گرد گھیرا ڈالے 'مہکتی ہوئی' گلاب کے پھولوں کی لڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کی۔ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔ یکا یک ہی کوئی خیال آ جانے پر اس نے ہتھیلی منہ پر رکھ کر ہنسی کا رستہ روکا۔ بھلا کوئی دیکھ سن لیتا تو کیا سوچتا؟

یہ کہ دلہن بیگم کو شادی کی خوشی اس قدر ہے کہ اکیلے میں بھی کھلکھلائے جاتی ہیں! یا یہ کہ ارمانوں بھری اس رات کا انہیں دو لہے میاں سے زیادہ انتظار تھا! یا یہ کہ تمن کروں کے اپارٹمنٹ سے دس کمروں کے وسیع و عریض بنگلے میں آ جانے والی بے پناہ خوشی اس سے ہنسم نہیں ہو پائی اور وہ کم ظرفوں کی طرح کھی کھی کر کے تھوڑی سی خوشی باہر چھلکا رہی ہے۔ کوئی اسے یوں ہنستے مسکراتے دیکھ لیتا تو اس طرح کا کوئی بھی اندازہ لگانے میں حق بجانب ہوتا۔ بھلا جلد عروسی میں اپنے دلہن کا انتظار کرتی ہوئی کوئی لڑکی ایسے تہقہہ مار کر کب ہنستی ہے؟ آس پاس چینل شوخ لڑکیوں کا میلہ لگا ہوتا تو ممکن ہے کہ کسی دل دھڑکا دینے والی بات پر شریلی مسکان لبوں کو چھیڑ جائے۔ ورنہ تو لڑکی اپنوں سے تازہ تازہ جدائی پر ایسے گلاب کی مانند لگتی ہے جو کھل کر خوشبو تو دے رہا ہو لیکن اس کے سینے پر داغ بھی نمایاں نظر

آتا ہو۔ لہن کا گلاب چہرہ بھی آنے والے جادوئی لمحوں کے احساس سے لوتو دیتا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں دکھ کی گلابی نمی بھی محسوس ہوتی ہے۔ یہی لہن کا حسن ہے۔

اس نے اپنے چھوٹے سے سنہری پرس کا منہ کھولا اور ننھا منسا گول آئینہ نکال کر اپنا میک اپ چیک کرنے لگی۔ سب کچھ بالکل ٹھیک تھا! آنکھوں کا کاجل اپنی حدوں میں مسکرا رہا تھا۔ ہونٹوں کی لپ اسٹک بھی بالکل تازہ تھی۔ چہرے پر خوشی کی چمک صاف محسوس ہوتی تھی۔

اس نے سر واپس پرس میں رکھ دیا اور پھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ وہ بھلا کیوں اداس ہوتی؟ اپنی رخصتی کے موقع پر چھوٹے آنسو کیوں بہاتی؟ بھائیوں کا مشترکہ گھر چھوڑتے ہوئے اسے اپنی ماں یاد آئی بھی تھی تو اس نے چشم تصور سے ماں کی روح کو شانت ہو کر مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

اسے بھلا کیوں رونا آتا؟ وہ پرانے گھر سے اپنے گھر جا رہی تھی۔ بھائیوں کا گھر پرایا ہی تو ہوتا ہے۔ اور ایسا گھر جہاں نہ باپ کے محفوظ سائبان کا احساس ہو نہ ماں کی پر شفقت و مہربان گود دستیاب ہو۔ جی ہلکا کرنے کے لئے جہاں واش رووم کا سنک ٹی میسر آتا ہو کسی ہمدرد وہم زباں کا کاندھانہ ملے۔

ہاں! وہ ہنس رہی تھی۔ بے پایاں خوشی اور سکون کا احساس اسے گدگدا رہا تھا۔ ایسا احساس جس سے تیس سال کی عمر میں وہ پہلی بار روشناس ہوئی تھی! یہ احساس کہ وہ "اپنے" گھر میں تھی! یہ احساس کہ بھلا خربسہ لڑکیوں کی طرح اس کی بھی شادی ہو گئی تھی۔ یہ احساس کہ اسے پسند کیا گیا تھا۔ اسے آخر کار ایک باغزت گھر کی بہو بن جانے کی نوید دی گئی تھی۔ کتنا کنھن سفر تھا اس کا آگے کے کتنے دریا پار کر لیجے تھے اس نے۔ بیس برس سے تیس برس کا ہو جانا کوئی آسان بات تھی؟ جیسے سفر کرتے کرتے ٹھکنا کی حد ختم ہو اور تپتے صحرا کا سفر دیکھ کر تھکنا اور ہمسفر کی عدم دستیابی کا احساس کے ساتھ دس سال کا طویل عرصہ اس نے بتایا۔ رستے میں کتنی کنھنائیاں تھیں۔ کیسی کیسی مشکلیں تھیں!

دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی رافندہ! پیدا ہوئی تو ماں باپ نے بہت خوشی منائی تھی۔ ماں کو اپنا دیکھ سکھ بانٹنے کو سبیلی مل گئی تھی۔ اس نے بیٹی کو بے حد چاؤ سے پالا۔ بہت لاڈ اٹھائے۔ سولہ سال تو جیسے پھولوں کے بستر پر گزرے تھے۔ کسی دکھ پریشانی سے واسطہ نہ

پڑا۔ کوئی فکر کبھی چھو کر نہ گزری۔ باپ اور بھائی بھی دیوانے تھے۔ آگے پیچھے پھرا کرتے دکھ سے پہلی پہلی آشنائی باپ سے جدائی کی صورت ہوئی۔ سولہ برس کی تھی جب باپ ایک نریٹک حادثے میں اپنے خاندان کو چھوڑ کر چل دیا۔ بھائی دونوں بڑے تھے اور تب تک اس قابل تو ہو چکے تھے کہ ماں اور اکلوتی بہن کے سر کا سائبان بن سکیں۔ دونوں نے ادھر ادھر ہاتھ پیر مارے اور کسی نہ کسی کنارے سے ٹک سی گئے۔ نوکریاں بھی کیں اور پڑھائی بھی کرتے رہے۔ اسے بھی بھائیوں کی دیکھا دیکھی نوکری کا شوق چڑایا تھا۔ اس نے بھی انٹر پاس کر کے ایک پرائیویٹ اسکول میں نوکری کر لی اور اپنا تھوڑا بہت خرچہ خود ہی اٹھانے لگی۔ ماں نے جلد ہی دونوں بھائیوں کے سر پر سہرا سجا دیا اور گھر میں بہوئیں لے آئی۔ گھر میں کل تین کمرے تھے۔ ایک ایک کمرہ دونوں بھائیوں نے لے لیا۔ تیسرے کمرے میں یہ ماں بیٹی بسیرا کرنے لگے اور پھر اس کی عمر کا مشکل دور شروع ہوا۔ اسے بیابنے کے منصوبے بننے لگے۔ ماں، بیٹیوں اور بہوؤں سے سر جوڑ کر باتیں کرنے لگی۔ گھر میں رشتے کرانے والیوں کی آمد و رفت شروع ہوئی اور ان کے توسط سے لوگوں کا آنا جانا رہنے لگا۔

دو بیس برس کی تھی! گھر میں جوان بھائیوں کوئی دلہنوں کے چونچلے اٹھاتے، ان کے آگے پیچھے رومانی گانوں کی دھنوں پر سیٹیاں بجاتے، پھرتے دیکھا تھا۔ ایک تصویر اتالی حسین نوجوان کو خوابوں میں اپنے آگے پیچھے پھرتا دیکھنے لگی جب بھی تنخواہ ملتی، بازار جا کر اپنے جینز کے لئے کوئی چیز لا کر رکھ لیتی۔ رفتہ رفتہ اس کے کمرے میں ڈبہ بند چیزوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ٹی وی، سلائی مشین، برتن، الپٹی کس، واشنگ مشین..... دو کیا کچھ نہ خریدتی گئی۔ یہاں تک کہ عمر نے بیس کے ہندے سے چھلانگ ماری اور سیدھی پچیس پر جا گری۔ درمیانی عرصہ تو رشتوں کے جھوم اصرار و انکار اور جینز کی تیاری میں یوں گم رہا تھا کہ اسے ان چند سالوں کے آنے اور چلے جانے کی خبر تک نہ ہوئی۔

پچیس برس کی ہوئی اور ایک دن اچانک دل کا دورہ پڑنے سے ماں داغ مفارقت دے گئی تب جیسے وہ ہر بڑا کر کسی خواب سے جاگی تھی!

یہ کیا ہوا؟ وہ کہاں کھڑی تھی؟ اسے کہاں جانا تھا؟ اس کے ساتھ کون کون تھا؟ وہ گھبرا گھبرا کر اس پاس دیکھے گئی۔

تب اس نے جانا کہ وہ اکیلی تھی! اس کے آس پاس جو تھے وہ اس سے دامن چھڑانے کی شدید خواہش رکھتے تھے۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ وہ گھر جس کا تاحال کچھ اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ جیسے کسی اجنبی رستے پر کھڑی تھی اور دن ڈھل رہا تھا!

دونوں بھائیوں کے دو دو بچے ہو چکے تھے۔ انہیں ایک کرو چھوٹا پڑا تھا۔ بھائیوں کو اچانک ہی اس کے بدن میں آگے ہوئے کانٹے چبھنے لگے تھے۔ انہیں اس کمرے کی اشد ضرورت تھی۔ جس کمرے میں رافدہ کا سامان اور رافدہ کا پلنگ پڑا تھا۔ انہیں رافدہ کی معمولی شکل و صورت سے چڑھنے لگی تھی جس کی وجہ سے اسے اچھا رشتہ نہ ملتا تھا۔ رافدہ کی کم پڑھائی پر وہ ناک بھوں چڑھا کر باتیں بناتی تھیں۔ کوئی مہن تو ایسا ہوتا جس کی بناء پر لڑکے والے ہاں کہہ کر جاتے! پھر آنے والوں کے چائے پانی کا خرچہ... بھلا اس قدر مہنگائی کے زمانے میں ہر دوسرے روز یک بکٹ منگوا کر چٹورے اور نندیدے لوگوں کا پیٹ بھرتا کوئی آسان بات تھی؟ وہ بھی ایسے لوگوں کو جو جاتے جاتے نہ کہتا نہ بھولتے تھے۔

لڑکی کا رنگ کم ہے۔

لڑکی کی عمر زیادہ ہے۔

لڑکی کے بال لمبے نہیں ہیں۔

لڑکی کی تعلیم کم ہے۔

اس نے خود تقریباً ہر طرح کا اعتراض سنا۔ اس طرح کہ وہ وجود سے عدم بننے لگی۔ اس کی شخصیت و حوہ میں پڑی برف کی طرح کھیلنے لگی تھی۔ وہ اندر سے تھوٹی اور اوپر سے بڑی ہونے لگی۔ چھپیس، ستائیس، اٹھائیس ہر سال اپنی سالگرہ پر بے حد خوفزدہ ہو جایا کرتی۔ "یا اللہ! اگلی سالگرہ سے پہلے یا ڈوٹی بھیج دیتا یا ڈولا!"

وہ رات کو رو کر دعا کرتی۔ بھائیوں کے تیور خطرناک سے خطرناک تر ہوتے جا رہے تھے۔ وہ انہیں ایک مستقل خطرہ نظر آنے لگی تھی۔ ان کی گفتگو برچیوں کی صورت اختیار کرنے لگی تھی جب ایک دن قسمت کا قفل کسی اسم اعظم کی برکت سے کھلا۔

پانچ عورتیں اسے دیکھنے کے لئے آئی تھیں! سب کی سب ایسی حسین و جمیل کہ بندہ لمبوں کانٹے لگے تو اٹھیاں کٹ جائیں! اس کی بھابھیاں چونکہ کچھ کاٹ نہ رہی تھیں سو

الٹیاں دانتوں سے ہی کاٹنے لگیں۔

"انہوں نے کہاں اسے پسند کرتا ہے؟"

"ارے... چاند کی طرح چمک رہی ہیں پانچوں... رافدہ تو چاند کا داغ بھی نہیں۔"

"کھائیاں سونے کی چوڑیوں سے بھری پڑی ہیں... گلے میں چار چار سونے کی

زنجیریں ہیں۔ خاندانی رئیس معلوم ہوتے ہیں۔"

دونوں بھابھیاں ہر مرتبہ آ کر اسے ایک نئی بات کہتیں۔ وہ چھوٹے سے کچن میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ چائے اور دیگر لوازمات بھی اس نے بھابیوں کے ہاتھ ہی اندر بھیج دیئے تھے۔ بھلا اپنا مذاق بنوانے سے کیا حاصل تھا؟ بھابیوں سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں اس نے مہمانوں کے سامنے جانے کا ارادہ ہی منسوخ کر دیا تھا۔

لیکن پھر آنے والیوں نے بعد اصرار سے بلوایا۔ وہ گئی تو سب نے بے حد تپاک سے مصافحہ و معافہ اور جاتے جاتے دوبارہ آنے کی نوید سنا گئیں۔ رافدہ کو تب بھی یقین تھا کہ وہ پانچویں پھر کبھی ان کے گھر کے آس پاس بھی نظر نہ آئیں گی۔ بھلا انہیں اپنے سب سے چھوٹے دیور سے کس جنم کا بدلہ لینا تھا جو وہ رافدہ کو اس کے لئے پسند کرتیں! وہ تو ان کے درمیان بیٹھی نظر کا ٹیکہ ہی معلوم ہوتی!

تب اچانک ہی سب گھر والوں کو حیرت نے پتھر کا کر دیا۔ ان پانچ عورتوں میں سے دو عورتیں پھر آئی تھیں اور اب باقاعدہ طور پر رافدہ کا ہاتھ مانگ رہی تھیں۔ وہ اپنے سب سے چھوٹے دیور عمران کے لئے اب پسند کر چکی تھیں۔

بڑی بھابی جب رافدہ کو یہ خوشخبری سنانے کے لئے کمرے میں آئیں تو اتنا بڑا بوجھ ہلکا ہو جانے کا احساس ان کے انداز میں کہیں نہیں تھا۔ وہ اڑی اڑی رنگت اور پھپھکی پھپھکی مسکراہٹ کے ساتھ اسے مبارک باد دے کر ان عورتوں کے پاس لے گئیں۔ وہ دونوں لڑکے کی بڑی بھاد میں تھیں۔

"میرا نام قدسیہ ہے۔" ایک مسکرائی تھی! میں تہبہاری سب سے بڑی بھابھی ہوں۔"

"میں یاسمین ہوں۔" دوسری بھی خندہ پیشانی سے بولی! میں دوسرے نمبر کی بھابھی ہوں۔"

"یہ کئی چھ بھائی اور تین بہنیں ہیں۔" قدسیہ بھابی اسے تفصیل بتانے لگیں۔

”ہمارا خاندان ماشاء اللہ بہت بڑا ہے۔ سب بھائی ایک ہی گھر میں رہتے ہیں۔ جتنا بڑا خاندان ہے اتنا ہی بڑا گھر بھی ہے۔ دراصل ہماری ساس چاہتی ہیں کہ ان کی زندگی میں بڑا وہ نہ ہو۔ وہ خود تو بیمار ہیں، بیماری بستر سے لگ چکی ہیں..... ان کا الھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، نوائلٹ، سب بستر پر ہی ہوتا ہے..... کبھی ایک بھو کی ڈیوٹی لگتی ہے کبھی دوسری کی..... پانچوں بھوکس مل کر ان کی خدمت کر رہی ہیں..... چھٹی بھو کو بھی یہ سب کرنا ہو گا.....“ وہ دبے دبے انداز میں بولیں۔

”دراصل عمران کا اپنی امی سے بہت پیار ہے.....“ اب یاسمین نے بولنے کی ذمہ داری سنبھالی۔ ”وہ کہتا ہے ایسی لڑکی سے شادی کرے گا جو اس کی ماں کا خیال رکھے۔ دن رات اس کی خدمت کرے، دعائیں لے، اسے لڑکی کی شکل صورت، خاندان، جہیز وغیرہ سے دلچسپی نہیں۔ ماشاء اللہ گھر میں کسی شے کی کمی نہیں۔ روپیہ پیسہ اللہ نے بہت دیا ہے۔ لڑکے کبھی قابل اور نیک ہیں۔ اپنا بزنس ہے..... سب پیار محبت سے، اتفاق سے، مل جل کر رہتے ہیں۔ ہاں! البتہ آنے والی کو اپنی ساس کی خدمت کرنا ہوگی۔“

یاسمین نے رافعہ کا جھکا ہوا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

”ہاں! ہاں کیوں نہیں.....“ رافعہ کی بھابی جلدی سے بولی تھیں۔ ”بہوؤں کا فرض ہے ساس سر کی خدمت کرنا۔ اللہ بخشے جب تک ہماری ساس زندہ رہیں، ہم نے جی جان سے ان کی خدمت کی، کوئی کمی نہ کی..... جھولیاں بھر بھران کی دعائیں لیں..... رافعہ تو خود گواہ ہے اس بات کی!“ رافعہ سے سر اٹھا کر انہیں دیکھا نہ گیا۔

”پھر ہم..... یہ رشتہ پکا سمجھیں؟“ قدسیہ بھابھی بولیں۔

”ضرور بہن..... بہت بہت مبارک ہو.....“ رافعہ کی بھابی اُنھ کے سب کا منہ میٹھا کرانے لگیں رافعہ شرما کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ اس کا دل خوشی کے مارے گیس کے غبارے کی طرح اوپر ہی اوپر جاتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ انگ انگ سے کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ چہرہ گنارہور ہوا تھا۔ ایک معمولی شکل و صورت اور معمولی گھرانے کی لڑکی کے لئے ایسا رشتہ نعمت غیر مترقبہ سے کسی طور پر کم نہ تھا۔ لڑکے کی بھابھیاں نے ماڈل کی لشکارے مارتی گاڑی میں بیٹھ کر آتی تھیں رافعہ خود کو اسی گاڑی میں چاند گھر کی سیر کرتے ہوئے دیکھنے لگی تھی۔

”لڑکے کی ماں کی خدمت کروانی ہے اس سے.....“ اس کے کانوں میں چھوٹی بھابھی کا سلیکٹ جملہ پڑا تھا۔ ”تجسبی لئے جارہے ہیں بناء شکل و صورت دیکھئے..... مہنبہ بھلا ملازماؤں کی شکلوں پر بھی کوئی غور کرتا ہے!“

رافعہ نے سنا اور ان سنی کر دی۔ وہ بہت خوش تھی۔ یہاں بھی تو وہ بھائی اور بھائیوں کی خدمت ہی کر رہی تھی۔ اس پر سو سو باتیں بھی سنتی تھی، پھر ایک ساس کی خدمت کر کے اپنے شوہر کو خوش کرنا کون سا مشکل کام تھا؟



رات آہستہ اور ہنسی تو ہنسی مسکراتی، بیچ پر تنہا ہی انٹیلیاں کرتی رافعہ کا ماتھا ٹھنکا۔ کسی کی آمد کا کچھ سراغ نہ تھا! پانچ بھابھیاں اور تین مندی بھی کچھ ہی دیر اس کے پاس بیٹھی تھیں پھر کسی کو اپنے بچے یاد آ گئے تھے تو کسی کو اپنا شوہر۔ وہ سب کی سب بھائیاں لیتی ہوئی چلی گئی تھیں۔ یوں بھی لمبے چوڑے خاندان کی یہ آخری شادی تھی۔ سبھی ان جمیلیوں سے اکتا چکے تھے اب شادی بیاہ کے قصبے نمٹنا بھی ایک در دسری کی مانند تھا۔ عورتیں تو بہت جلد ان چکروں سے ادب جایا کرتی ہیں۔ انہیں اپنی شادی ہو جانے کے بعد دوسری شادیاں کچھ زیادہ نہیں بھاتیں نرا آرام کا نقصان! بے سکونی۔

رافعہ لڑیوں سے گلاب اور گلابوں سے چٹاں توڑتی رہی۔ بکھیرتی رہی۔ حتیٰ کہ گھڑی نے دو بجاد دیئے اسے نیند ستانے لگی۔ دولہا میاں پر غصہ آنے لگا۔ پہلی پہلی رات ہی بے نیازی کا یہ عالم تھا! آئندہ زندگی میں کیا امید کی جاسکتی تھی؟

اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور رافعہ نے سنہری شیردانی کی جھلک دیکھی۔ وہ جلدی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ دل تیز تیز دھڑکنے لگا تھا۔ ہتھیلیاں جھکے لگی تھیں۔

”السلام علیکم.....“ آنے والا اس کے قریب بیٹھ گیا۔

آواز میں جھٹکن اور پریشانی تھی۔ رافعہ نے جھینپے جھینپے سے انداز میں جواب دیا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ حیات چوکس تھیں۔ جسم غیر محسوس طور پر اکڑا ہوا تھا۔ وہ دولہا کی جانب سے کسی شوخ سی جسارت کی ذہنی طور پر پیش بندی کر رہی تھی۔

”امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے.....“ دولہا کے اگلے جملے نے اس کے تپے ہوئے

اعصاب پر بہت مہارت سے سفر کیا تھا اور ٹھیک اس کے دماغ پر جا کر لگا۔

اس کے اعصاب کا تناؤ یکا یک رخصت ہوا وہ پوری آنکھیں کھول کر اپنے شوہر کا چہرہ دیکھنے لگی۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ رانہ کے دل کو یک گونہ تسلی ہوئی۔ خوشی ایک بار پھر اس کے وجود میں رقص کناں ہوئی۔ اس کا جی چاہا مارے خوشی کے خود ہی اس سے لپٹ جائے۔ لیکن اگلے ہی پل اس کی خوشی میں واضح کمی ہوئی۔ وہ بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔

”میں اب تک امی کے پاس ہی تھا۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”یہاں سب لوگ اس قدر خود غرض ہیں کہ چیخ اٹھنے کو جی چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے، موقع ایسا ہے کہ سبھی تھک چکے ہیں، لیکن ایسی بھی کیا تھکن جو اس قدر بے حسی طاری کر دے کہ ایک بیمار لاچار شخص سے وہ بول محبت کے نہ بولے جائیں۔“

رانہ کے رومانی جذبات آبی بخارات کی مانند اڑنے لگے۔ اس شخص کے انداز میں ایسی ہی تپش تھی۔ ”امی اپنے کمرے میں بالکل اکیلی ہیں۔“ وہ بولا۔ ”سب بھابھیاں اپنے اپنے کمروں میں جا چکی ہیں اور تو اور میری بہنیں تک اپنی ماں کی خاطر اپنی نیند کی قربانی دینے پر تیار نہیں ہیں۔ گھر میں سبھی سو چکے ہیں۔ تم کہو کیا اس مصورت حال میں میں اپنی سہاگ رات منا سکتا ہوں؟ جبکہ دوسرے کمرے میں میری ماں تنہا بڑی اپنی بیماری سے نبرد آزما ہو؟“

رانہ کے دل کو یکا یک مایوسی اور شکست کے دبیز بادلوں نے گھیر لیا۔ خوشی اور شونی بجھ کر رہ گئیں۔ اسے اپنی زندگی کی سب سے خوبصورت رات کے زیاں کا احساس ستانے لگا۔ اس کا دولہا بالکل بھی اس کی جانب متوجہ نہ تھا۔ اس نے رانہ کے چہرے کو غور سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ اس کا ہار سنگھار بے کار گیا۔ سب تہادی کر کری ہو گئی۔ سب جذبے بالکل ماند پڑ گئے۔ گویا وہ لہے میاں نے لائین کی لو بالکل نڈھم کر دی تھی۔

”ہم اتنے خود غرض نہیں ہو سکتے۔“ یکا یک اس نے سراٹھا کر رانہ کو دیکھا۔ ”ہم دوسروں کی نرح بے حس نہیں ہیں۔ پیار محبت کی باتوں کے لئے عمر بڑی ہے رانہ۔ آؤ آج کی رات ہم دونوں مل کر امی کی خدمت کریں اور ان کی دعا لیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟“

”جی!“ وہ بہت بہت کمر کے بوٹی تھی۔

”آؤ میرے ساتھ۔“ وہ کھڑا ہوا۔

رانہ بھی اس کی تقلید میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ جنت جیسے کمرے کو چھوڑ کر کہیں جانے کو بالکل سن نہ کرتا تھا۔ ابھی تو اس نے اپنی رونمائی کا کوئی تھک تک رسول نہ کیا تھا۔ ابھی تو چاہت کے اظہار کا پہلا پہلا لین دین بھی نہ ہوا تھا۔ ابھی تو اس کی زخمی سوچیں سکتی رہیں اور وہ اپنے میاں کے پیچھے چلتی رہی۔

چند قدموں کے فاصلے پر ہی اس کی ساس کا کمرہ واقع تھا۔ گویا اس بات کا پورا پورا خیال رکھا گیا تھا کہ رانہ ان کے نزدیک تر رہے۔

وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو بستر پر پڑا نحیف و نزار وجود دکھانے لگا۔

”آؤ رانہ۔ امی سے ملو۔“ عمران ماں کے قریب بیٹھ گیا۔

رانہ نے ساس کو بہت ادب سے جھک کر سلام کیا۔

”جیتی رہو۔۔۔۔۔ جیتی رہو۔۔۔۔۔“ انہوں نے کھانسی کے درمیانی وقفوں میں کہا تھا۔

”بیٹھو۔۔۔۔۔ یہاں میرے پاس بیٹھو۔۔۔۔۔“

رانہ اپنا بھاری بھر کم لباس سمیٹتی ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”ہاں ٹھیک ہے!“ انہوں نے اکھڑتی سانسوں میں بھی اس کا بغور جائزہ لیا۔

”ایسی ہی لڑکیاں اچھی خدمت گزار ہوتی ہیں۔ میں نے بہت غلطی کی۔۔۔۔۔ خوبصورت سے

خوبصورت بہوئیں ڈھونڈتی رہی۔۔۔۔۔ وہ سب کی سب شوخیں ہیں۔۔۔۔۔ باری باری گڑباز ہیں۔۔۔۔۔ ان سے تو بس ان کے شوہر ہی کھیل سکتے ہیں، بھل سکتے ہیں۔۔۔۔۔“

رانہ کا سر جھک گیا۔ ساس نے رونمائی میں کم نمائی کا طعنہ دیا تھا وہ بھی نئے دولہا کے سامنے۔ اسے بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔ جھک کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”بہت اچھی ہو تم!“ پھر وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولیں۔ ”مجھے پسند آئیں عمران بہت خوش رہے گا۔ یاد رکھنا۔ یہ ایک ماں کے دل سے نکلی ہوئی دعا ہے۔“

رانہ کا ٹوٹا ہوا دل پھر سے سنبھلا۔ ہونٹ مسکرائے۔ وہ ہلکی سی ہنسی لگی۔

ساس نے اپنی انگلی سے زمرہ کی انگوٹھی اتار کر اسے پہنا دی۔

”یہ لو اپنا تھنہ۔ عمر بھر سنبھال کر رکھنا۔ اتنے قد سید کی بہت نظر ہے اس پر۔۔۔۔۔“

کئی بار ماتحت چکی ہے عمر میں نے نہیں دی۔ کیوں وہ اسے؟ کیا خدمت کی ہے اس نے

میری؟ بیٹیاں تو فطری طور پر ہی پیاری ہوتی ہیں لیکن بہت جی پر چڑھتی ہے جب جی جان سے خدمت کرے..... میری پانچ بیویاں آئیں..... سب کی سب نکلی ہذا حرام..... اب چھٹی تم ہو..... دیکھتے ہیں تم کیسی نکلتی ہو.....

وہ مسلسل بولنے کی عادی تھیں۔ وہ سب کچھ جوان کے دل میں آتا تھا۔ ان کے دل اور زبان کے درمیان غالباً سوچ کا کوئی مقام نہ تھا۔ پھر انہوں نے خاموش بیٹھے ہوئے عمران کو دیکھا ”میرے بیٹے!“ وہ اسے چکار کر بولیں ”کیوں بیٹھے ہو؟ جا کر سو جاؤ..... میں اب ٹھیک ہوں!“ رانہ کے تھکے تھکے جذبات پھر سے چوٹے۔ رہائی کا پروانہ ہاتھ آنے لگا تھا۔ اب شاید چند رنگین لمحات کی اجازت ملنے لگی تھی۔

”نہیں امی!“ عمران بولا ”آپ سو جائیں پھر ہی میں جاؤں گا!“
 ”میں کہاں سوؤں گی اب..... میری نیند اڑ گئی ہے.....“ وہ بولیں ”اب تو بقیہ رات آنکھوں میں ہی کئے گی۔ سانس بار بار اکھڑتا ہے.....“
 ”پھر ہم بھی یہیں بیٹھے ہیں۔“ عمران بولا۔

رانہ کا سر جھکنے لگا۔ اسے زیورات کا بوجھ محسوس ہونے لگا۔ گردن درد کرنے لگی۔
 ”تم تو صبح کے اٹھے ہو..... دن بھر کی بھاگ دوڑ۔ تمہارا آرام کر لو..... ہم ساس بہو تو خوب باتیں کریں گے..... تم جا کر نیند لے لو!“

”چھن“ سے رانہ کے جذباتوں کے بلوریں جام لڑھکے اور ٹوٹ گئے۔ نیند بھک سے اڑ گئی۔ دماغ سائیں سائیں کرنے لگا۔ اس قدر حسین رومانی رات اور بیمار نیم پاگل ساس سے گفتگو میں گزر جائے! ہائے! جذباتوں کی ایسی بے قدری اور کہیں نہ ہوئی ہوگی۔
 اس کا دل دہائیاں دینے لگا۔ خاموشی سنسنے لگی۔ کہیں وہ ماں کی بات مان ہی نہ لے۔ کہیں وہ اسے وہاں چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ اس کی وہاں موجودگی سے تو پھر بھی دل کو کچھ ڈھارس تھی۔

”رانہ!“ عمران بولا ”تم لباس تبدیل کر آؤ۔ ان کپڑوں میں تو تھک جاؤ گی۔“
 پھر تم یہاں امی کے پاس سو جاؤ۔ میں اپنے کمرے میں چلا جاؤں گا!“
 ہائے! وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ وہ دشمن جاں اسے کس اطمینان سے وہ رنگ روپ

بگاڑ دینے کے لئے کہہ رہا تھا۔ اس نے تو ٹھیک سے اسے دیکھا تک نہ تھا..... اس کی تعریف میں ایک لفظ تک نہ بولا تھا۔ وہ روپ جو کوئی لڑکی پہلی اور آخری مرتبہ اپناتی ہے اس روپ کو مٹاتی رانہ کا دل بھر بھر آ رہا تھا۔

لباس تبدیل کر کے زیورات سے بری ہو کر چہرہ دھو کر واپس ساس کے کمرے میں چلی آئی۔ عمران اب کرسی پر بیٹھا اٹک رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر جلدی سے کھڑا ہو گیا تھا۔
 ”امی کا خیال رکھنا!“ وہ اسے تاکید کر کے چلتا بنا۔

رانہ ست ردی سے اسی کرسی پر جا بیٹھی تھی! وہ بے حد پشیمانی محسوس کر رہی تھی۔ ایسا تو اس نے اپنی تیس سالہ زندگی میں کبھی نہ سنا تھا کہ کسی آدمی نے اپنی سہاگ رات یوں اپنی بیمار بڑھی ٹھنڈی ماں کے سر پر سے وار کر پھینک دی ہو۔ یوں تو روز صبح ہوتی ہے روز رات آتی ہے لیکن ہر شے کی ایک الگ قدر و قیمت ہوتی ہے۔ اس قیمت کو محسوس کرنا چاہئے۔ اس شے کے اصول ہونے کا لحاظ ہونا چاہئے ورنہ تو زندگی میں کسی بات کی کچھ اہمیت ہی نہ ہو۔ وہ دہن بنی کیا کیا ارمان ہوتے ہیں نہیں بنتی لڑکی کے دل میں وہ سچ پر بیٹھی کیسے اصول خزانے جیسے جذباتوں کو محسوس کیا اس نے..... لیکن خالم ماں اور نادان بیٹے نے ہر جذبے کو پامال کر ڈالا۔ سبھی ارمان خاکستر کر دیئے۔

”اداس ہو؟“ فیروزہ بیگم کی سرگوشی نما آواز نے اسے چونکا دیا۔
 ”جج..... جی.....“ وہ کرسی پر سے گرتے گرتے بچی پھر سنبھل کر بیٹھ گئی!
 ”نن..... نہیں تو امی جان..... بھلا میں کیوں اداس ہونے لگی؟“
 وہ مسکرائیں۔ جیسے انہوں نے بلی کے بچے کو اچھلتی گیند سے ڈرتے دیکھا ہو۔ ان کی نظروں سے اس کی بے عقلی کے لئے ایسا ہی معصومانہ تسخر تھا

”آج تمہاری شادی کی پہلی رات ہے۔ اور تم یہاں ججہ بڑھئی کی تیار داری کو بیٹھی ہو..... تمہیں یوں لگتا ہو جیسے تم پر ظلم کی انتہا ہو گئی ہے۔ ہے نا؟“
 رانہ ان سے خوف زدہ ہو گئی۔ وہ تو بہت ہوشیار خاتون تھیں۔ اسے یوں لگا جیسے وہ تیار کی کاٹانک رچائے لینی ہوں۔ اس وقت وہ بالکل بیمار نہ نکلتی تھیں۔
 ”نہیں امی جی!“ وہ نگاہیں جھکا کر تھوک نکل کر بولی ”ایسی تو کچھ بات نہیں۔“

”باپ کس برس کی تھی میں جب دہن بنی!“ فیروز دینم کی ذرد آنکھیں یکا یک کسی پرانی مگر قیمتی سوچ کے اثر سے چمکیں۔ ملازمے رئیس لوگ تھے ہم بہت خرچہ کیا تھا۔ میرے باپ نے اس زمانے میں میرا شادی کا جوڑا پچاس ہزار میں تیار ہوا تھا۔ لوگوں نے انگلیاں چبا ڈالی تھیں اپنی۔ باہ!“ رانہ کی خند ذرا پیچھے ہٹی۔ اس نے پوری آنکھیں کھول کر ان کا چہرہ دیکھا۔ ذرورہ جھیرلوں سے بھرا چہرہ اور پچاس ہزار کے غرور کے جوڑے کا خیال! آج بھی اس خیال نے اس بیچارہ چہرے کو قدرے رونق دے دی تھی۔ دو کسی سوچ میں گم مسکرا رہی تھیں۔

سے لے لوں۔ عمر دو بازو گزاردوں..... جیسے عمر گزارنے کا حق ہوتا ہے..... میں نے تو اتنی لمبی عمر میں ناز، نخرے اور غرور کے سوا کچھ جانا ہی نہیں۔ بڑا ٹیکہ تھا میرا..... بہت دبدبہ تھا۔ نوکر چاکر رشتہ دار سبھی نظر جھکا کر بات کرتے تھے مجھ سے.....“ وہ پھینکی سی ہنسی ہنس دیں۔ جیسے اندر ہی اندر رو دی ہوں۔

رافعہ کی خاموشی مگر تاسف سے بھری نظروں نے اب کی بار نہایت تفصیل سے ان کا جائزہ لیا کمزور لاغر وجود استخوانی ہاتھ، جھریوں دار پیلا چہرہ اور مردہ آنکھیں.....
”دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو.....“ وہ اسے اپنا جائزہ لیتا دیکھ کر دکھ اور حسرت سے بولیں۔ رافعہ نے جھٹ نکا ہیں جھکا لیں جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی ہو۔
”تم سوچتی ہو گی رافعہ..... اس بڑھیا نے تمہاری زندگی سے بہت قیمتی شے چھین لی ہے..... ہے نا؟“

رافعہ اب کی بار خاموش رہی۔ انہیں اونٹن کا توجہ سے سوق پڑنے کا ڈھنگ قدرت نے عطا کر دیا تھا۔ لیکن اب یہ فن شاید ان کے کسی کام کا بھی نہ تھا۔
”کچھ وقت گزر گیا تو تمہیں یہ بات یاد بھی نہ ہو گی۔“ وہ بولیں اور یاد بھی رہ گئی تو تمہارے نزدیک اس بات کی کوئی اہمیت نہ ہو گی..... تم اپنے شوہر کے ہمراہ لا تعداد خوبصورت راتیں بتا چکی ہو گی۔ سینکڑوں باتیں کر چکی ہو گی..... ہو سکتا ہے کبھی تم دونوں یہ بات یاد کر کے خوب ہنسو..... ہے نا؟“

”جی!“ وہ آہستہ سے بولی۔

”لیکن..... میری باتیں کبھی اپنے پلو سے جدا مت کرنا..... رافعہ! زندگی کی ابھی ابتداء کی ہے تم نے..... اور انتہا تمہیں دکھا دی گئی ہے..... یہ ایسا ہی ہے جیسے امتحانی پرچہ ملنے سے پہلے ہی اس کے سب سوالوں کا پتہ چل جائے..... ہاں! جواب تو تم نے ہی لکھنے ہیں لیکن سوالوں کا پتہ چل جانا کیا کچھ معمولی بات ہے؟ کاش!“

”کاش میری سہاگ رات بھی ایسی ہی گزری ہوتی..... تب شاید میرا دل بھی سینے میں سر پٹک پٹک کر روٹا۔ لیکن امتحانی پرچہ تو دیکھ لیتی میں..... دل کا کیا ہے..... یہ تمہیں خود سزا مندی بچہ ایک کھلو نامل جائے تو دوسرے کھلوتا کے لئے رونے لگتا ہے..... ہے نا رافعہ؟“
”جی امی جان!“ رافعہ بھی اسی دھند میں دیکھنے لگی جس دھند میں فیروزہ بیگم دیکھ

رہی تھیں۔ اسے ایک حسین، نیک، دولت مند، نو جوان کی ہمراہی ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر عطا ہوئی تھی اور وہ ایک رات کے زیاں کے افسوس تلے کرا رہی تھی!

اسے پہلی بار فیروزہ بیگم کی گفتگو کے غیر معمولی پن کا اندازہ ہوا۔ اس کی نیند اب مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔ دماغ پوری طرح چوکس تھا۔ ایسی گفتگو وہ زندگی میں پہلی بار سن رہی تھی۔ وہ کمرہ مکالموں کی مہک، بیج کی لڑیاں..... وہ سب کچھ بھول بھال کر موت کے آہنی ہاتھوں سے نبرد آزما اکھڑتی سانسوں کی کہانی سننے لگی تھی۔

”عمر ایسے گزری جیسے کوئی پرندوں سے بھرا ہوا پنجرہ کھول کر زور زور سے ہلائے اور پرندے ایک دوسرے سے الجھتے، گرتے پڑتے کھلے دروازے سے نکل نکل کر آسمان کی وسعتوں میں گم ہوتے چلے جائیں..... ایسے ہی رافعہ..... بس ایسے ہی گزر گئے اس دھوکہ باز زندگی کے سبھی سال..... اب خالی پنجرہ منہ چڑا رہا ہے کہ ہے کچھ ڈالنے کو؟ شاید کچھ نہیں ہے..... کچھ بھی نہیں!“

وہ تھک کر گہرے گہرے سانس بھرنے لگیں۔

”بہت مان تھا مجھے..... بہت غرور تھا، چھ بیٹوں کی ماں تھی میں! چھ بیٹے..... مقدور سے ملتے ہیں۔ مقدور کی تو دھنی تھی! سوچتی تھی ایسی بیویوں کی لاؤں گی کہ ایک زمانہ دیکھے گا..... لڑکیاں دیکھنے جایا کرتی تو ناک بھوں چڑھا کر لوٹتی..... کسی میں کوئی عیب ڈھونڈتی، کسی میں کچھ نقص بتاتی..... بیروں جیسی لڑکیاں تلاش..... ایک سے بڑھ کر ایک..... بڑے بڑے اونچے خاندانوں کی لڑکیاں دیکھی ہیں نا تم نے پانچوں؟ ہے کوئی کی کسی میں؟“

پھر وہ نیم دیوانچی سے ہنسیں۔ کچھ دیر ہنستی رہیں۔ رافعہ خوفزدہ سی ہو گئی۔

”کی تو میرے مقدور میں ہوتی گئی..... ہر عروج کو زوال ہے نا..... بھول گئی تھی میں..... حسن گیا، جوانی گئی..... ایک ایک کر کے پرندے اڑتے گئے..... اور اب دیکھو مجھے! ان پانچ بیٹوں میں سے ایک بھی ایسی نہیں جسے یہ بات یاد ہو کہ میں اسے کہتے چاؤ سے بیاہ کر لائی اور اپنا خون بکھر جلا کر پالا ہوا بیٹا اسے دیا۔ سب میرے بیٹوں پر ایسا حق جاتی ہیں جیسے نہیں بھی اپنے میکے سے لائی ہوں.....“

رافعہ نے دھیرے سے اپنا ہاتھ ان کے استخوانی ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے

خلوص کا اظہار کرتا چاہا تھا۔

”ہاں ہاں..... جانتی ہوں..... تم ایسی نہیں..... تم اچھی ہو..... عمران تمہیں میری خدمت کے لئے ہی لایا ہے۔ ورنہ اسے رشتوں کی کمی تھی؟ ایک سے ایک حسین خاندانی کی مل رہی تھی اسے..... لیکن وہ بولا مجھے حور پری نہیں لانی۔ لڑکی ایسی ہو جو میری ماں کی نمائندگی کرے سے سنا لے..... بہوئیں عیش کریں اور گھر کی اصل مالکین نوکروں کے رحم و کرم پر زندگی بسر کریں۔ آخر سال گزارے..... کوئی انصاف ہے یہ؟ یہ گھر تو میرا ہی ہے نا؟ یہ میرے شوہر..... میرے لئے بنوایا تھا۔ اس کی ایک ایک اینٹ پر میری محبت اور میرے شوہر کی محنت کھدائی ہے۔ لیکن ان پانچوں نے مجھے عضو معطل جان کر اسے چھوٹے سے کمرے میں لاپھنگا ہے..... جیسے باقی جھگڑے پر تو میرا کچھ حق ہی نہیں حالانکہ یہ سب کچھ میرا ہی ہے۔ یہ گھر گاڑیاں بیک بیلنس..... بنے میرے ہیں تو سب میرا ہے؟ ہے ناراض؟“

”جی ای جان..... سب آپ کا ہے!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”لیکن..... لیکن میں کیا کروں اس سارے کچھ؟“ ان کی آواز رندہ گئی۔ ”میں اب کیا کروں ان چیزوں کا؟“ ساری عمر انہما چیزوں کی تمنا کی میں نے..... ساری عمر تمنا حاصل رہی مجھے لیکن اب..... اب کیا چاہوں راضی؟“

راضی کی آنکھیں بھر آئیں۔ وہ عورت کس قدر لاچار تھی۔ اتنے رشتے ماطوں کے باوجود کتنی اکیلی تھی۔

”بیٹے تو بیٹے..... بیٹیاں بھی لاپٹی ہیں..... سوچتی ہیں ماں مرے تو جسے بخرے ہوں..... انہیں ان کا حصہ ملے..... زمین میں حصہ، زیور میں حصہ، گھر میں حصہ..... ماں کو اپنے حصے میں کوئی نہیں رکھتا کوئی نہیں رکھتا راضی.....“

”ہم رکھیں گے ای..... میں اور عمران..... ہمیں کچھ نہیں چاہئے..... ہم آپ کو لے لیں گے.....“ وہ ان پر جھک گئی۔

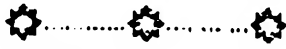
”ج“ وہ بے تحاش خوش ہوئیں۔ ”ج“ کہہ رہی ہو..... خدا تمہیں خوش رکھے..... تم رکھو گی نا مجھے؟ میری خدمت کرو گی.....“

”جی ای..... میں آپ کو اپنے ساتھ رکھوں گی..... آپ کی خدمت کروں گی.....“

”خدا تمہیں خوش رکھے..... شاد آباد رکھے.....“ وہ مطمئن ہو گئیں۔

پھر جیسے جلتے ہوئے پر پھایا رکھ دیا گیا۔ زخم مندمل ہونے لگا۔ درد کو قرار آنے لگا۔ فیروزہ بیگم باتیں کر کر کے تھک گئی تھیں۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔

راضی نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ پانچ بجنے والے تھے۔ اسے شدید تھکن کا احساس ہوا۔ اس نے سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔ کچھ ہی دیر میں وہ گہری نیند سو گئی تھی۔



اچانک جا بونے والے غل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر جاگی۔ اس کی نیندیں اپنی ماں کو بلارہی تھیں۔

”ای جی..... ای جی..... انہیں..... آنکھیں کھولیں..... ہائے ہائے ہائے ہماری ماں.....“

راضی اچھل کر گھڑی بوجھی۔ اس نے گھڑی کی سمت دیکھا جو صبح کے آٹھ بج رہی تھی۔ اس کی نیندیں مسلسل چیخ رہی تھیں۔ کمرہ لوگوں سے بھرنے لگا۔

فیروزہ بیگم اپنی عمر کی کتاب کا آخری صفحہ اسے سنا کر کتاب بند کر چکی تھیں۔ اس کی خدمت کی آس پر اسے آباد رہنے کی دعائیں دے کر وہ ہنا کوئی خدمت لئے بیٹھ کے لئے جا چکی تھیں۔ راضی نئی ٹولی ڈھن تھی۔ کسی نے اس کا خیال کر کے اسے اس کے کمرے میں پہنچا دیا۔ وہ کوئی کھوئی سی اسی بیچ پر آ بیٹھی۔

کمرہ دیسے ہی مہک رہا تھا۔ گلاب اب تک تر دتا زہ تھے۔ بستر بے دشمن تھا۔ لیکن راضی! راضی وہ نہ رہی تھی۔



گھر میں پلاؤ زردے کی تیز خوشبو رچی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کمروں اور دالانوں میں دریاں بکھی تھیں۔ جن پر خواتین اور بچے آڑھے ترچھے بیٹھے اور لیٹے ہوئے تھے۔ قرآن پاک کے سپارے جز دانوں میں محفوظ اونچے طاقتوں میں رکھے ہوئے تھے۔ تسمیوں اور دانوں کا ڈھیر جا بجا رکھا تھا۔ کسی کو اب مزید کچھ پڑھنے اور پڑھ کر مرحومہ کو ایصال ثواب کرنے میں دلچسپی نہ تھی۔ سبھی اکٹا چکے تھے۔ سوئم کا کھانا کھا لینے کے بعد اب اونگھنے اور دوسرے دنیاوی مسائل پر گفتگو کر چکے۔ کے بعد رشتہ دار اور ہم ہمسائیوں کو اپنا اپنا گھر آیا تھا۔ گھر والے تھکن سے شل ہو چکے تھے۔ عمران کی بیٹیں ایک کمرے میں بیٹھی مرحومہ ماں کے زیورات کے بنوارے پر بحث میں مشغول تھیں۔ پانچوں بیٹیاں اپنی ٹولی

الگ کیے بیٹھی تھیں اور نندوں کے خلاف بول کر اپنا اپنا دل صاف کر رہی تھیں۔

- رافعہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھی اور گھر میں پھیلی مصروفیت کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے پردے پر سے اپنی شادی کی رات کی فلم اب تک نہ اتری تھی۔ اس کا ذہن اب تک ان باتوں کی گردان کر رہا تھا۔ زندگی اپنی تمام تر سنا کی اور سبھی بے رحم حقیقتوں کے ساتھ اس کے مقابل تھی۔
- زندگی کی جو کتاب وہ شروع کرنے جا رہی تھی اس کا انجام اس نے پہلے ہی صنفی

پر دیکھ لیا تھا۔

”سب کچھ میرا ہی ہے نا؟ یہ گھر، گاڑیاں، بینک، بیلنس، بیٹے میرے ہیں تو سب

میرا ہے!“

ایک کمزور اور بے بس لہجہ اس کے کانوں میں گونجتا۔

”ماں کو کوئی اپنے حصے میں نہیں رکھتا!“

”تم رکھو گی نا مجھے؟ میری خدمت کرو گی؟“

”تمہیں یہاں میری خدمت کے لئے تو لایا گیا ہے۔“

رافعہ اپنے مہکتے ہوئے کمرے میں چلی آئی۔

ساری عمر ناز، فخر و دبدبے اور ٹیکے کے ساتھ بسر کر کے جانے والی کی اولاد اسی کے

گھر میں بیٹھی بٹوارے پر بحث میں مصروف تھی۔

جانے والی سب کی خدمت اور تعاون سے بے نیاز ہو چکی تھی۔

ہاں! مگر ایک تعاون اب بھی کیا جاسکتا تھا!

ایک خدمت ابھی باقی تھی!

رافعہ اس گھر میں اپنی آمد کا مقصد سمجھ گئی تھی۔

عمران کمرے میں دبے پاؤں داخل ہوا تو وہ قرآن پاک کھولے بیٹھی تھی۔ اس کا

چہرہ آنسوؤں سے تر ہوا تھا اور وہ ہاتھ اٹھائے مرحومہ کی بخشش کے لئے دعا گو تھی۔

بس! یہی ایک خدمت باقی تھی!



یہ بلبلیں، یہ تتلیاں

خزاں کا موسم پھر لوٹ آیا تھا۔ ہر سال کی طرح! فنا میں وہی دکھ بھری، بید بھری اداسی رچ گئی تھی۔ ہوا کے چلبے، مذہر گیت ایک علیحدہ ہی لے میں ڈھل رہے تھے۔ کوئل کی کو کو دل کو اداس کرتی تھی۔ جانے کیا کچھ یاد آنے لگتا تھا۔ لیکن اسے اداسی کو مہینز کرتی ان ہواؤں میں رہنا اچھا لگتا تھا۔ بیٹے ہوئے کل کی باتیں سن آنگن میں گونجتی رہتیں۔ اس کا دھیان بنا رہتا۔ محفل بجی رہتی تھی۔

زرد زرد خشک پتے اس کے قدموں تلے آ کر اپنی بے ثباتی پر کراہتے۔ وہ ان کی آواز کو بڑے غور سے سنا کرتا۔ کتنے پیغام پوشیدہ تھے ان مدہم مدہم سی سسکیوں میں کتنے موبہوم اشارے تھے جنہیں سمجھنے کے لئے ایسی ہی تنہائی درکار تھی۔ وہ اس سنگی بیچ پر بیٹھ کر فنا اور بقا کے فلسفے کی گتھیاں سلجھایا کرتا۔ سود و زیاں کا حساب کتاب، جمع، تفریق، ضرب، کیا کھویا، کیا پایا، وہ اپنے دل میں جھانکتا اپنے ہاتھوں کی جھریوں کو بغور دیکھا کرتا۔ اپنی انگلیوں کے رعشے کا بڑھاؤ جانچنے کی کوشش کرتا۔ پھر اسے خزاں کی ہواؤں میں رچے ہوئے نوے اپنی جانب متوجہ کر لیا کرتے تھے۔ وہ ان پر سردھننے لگتا۔ اپنا آپ بھولنے لگتا۔ سنگی بیچ کے بالکل ساتھ جاسن کا بیڑ تھا۔ جاسن کے اس بیڑ پر بہت سی اقسام کے پرندے بیک وقت جمع ہو جایا کرتے تھے۔ ان کی مختلف آوازیں مختلف سازوں کی مانند مل کر ایک انوکھا گیت ترتیب دیتی تھیں جو اس کے کانوں کو بہت دلکش لگتا تھا۔ وہ ہوا کے نوے اور ان نوحوں میں چھپا پیغام بھول جاتا۔ پرندوں کی آوازیں اسے اپنی جانب متوجہ کر لیتی تھیں۔ وہ جاسن تلے جمع پتھروں کے ڈھیر کو دیکھتے ہوئے چڑیوں کا گیت سنتا رہتا۔ پتھروں کا ڈھیر وہاں کھیلے ہوئے بچوں کی شرارت کا نتیجہ تھا۔ وہ جاسنوں کے حصول کے لئے پتھر اچھالا کرتے تھے۔ یہ

لگا جان پر الگ تکلیف جھیلو اور پھر بھی بیٹی؟“

واجدہ خاموش بیٹھا رہا۔ وہ بے حد تھک گیا تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ نے اس کے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ اسے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے اماں کی باتوں کی تائید یا تردید کی زحمت گوارا نہ کی۔

”پیسے کہاں سے لائے؟“

”ایک دوست سے امداد لایا ہوں؟“ اس نے سرکسی کی پشت سے نکا کر آنکھیں موند لیں۔
”بس ہو گئے خرچے شروع..... بیٹیاں تو پیدا ہوئیں اور باپ کو کمانے کی فکروں نے گھیرا.....“ اماں بے حد ملول ہوئیں۔ ”بیٹے پر خرچہ ہو تو جی کو تسلی تو ہوتی ہے کہ بڑھاپے میں یہ ہمیں کھلائے گا..... بیٹے کے خرچوں سے بھی خوشی ہوتی ہے..... خیر! جو اللہ کی مرضی!“
واجدہ کی بند آنکھوں میں مستقبل کے خواب بننے لگے۔ وہ چشم تصور سے خود کو انجانے بوجھ تلے دبا ہوا دیکھنے لگا۔ اماں کی باتیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔

نرس کی آمد سے اس کے خیالات میں قحط پیدا ہو گیا۔ وہ بچی لے آئی تھی۔ اس نے اسے اماں کی گود میں ڈال دیا اور خود مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔

واجدہ نے آنکھیں کھولیں۔ آف دھانت کمر میں لپٹا نا سادہ جود اماں کی گود میں تھا۔ اماں اپنی کچی ہوئی ساری باتیں بھول کر اب بے حد اشتیاق سے اسے دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ واعدہ کو بچی نظر نہیں آ رہی تھی۔ صرف اس کا ننھا منا گلابی ٹکڑا اسے دکھائی دیا۔ جیسے کسی گڑیا کا پیر ہو۔ اس کے دل کو کچھ ہوا۔ وہ اٹھ کر اماں کے قریب آ گیا۔ چھوٹے سے گلابی گول چہرے پر لمبی لمبی کالی پلکیں تھیں۔ وہ بے حد پیاری بچی تھی اپنی ماں کی طرح وہ بھی آنکھیں موندے بے خبر سو رہی تھی۔

”سیدہ ہے اس کا نام!“ اماں پلکیں میں نے سوچا تو ”حزہ“ تھا۔

خیر..... جو اللہ کی مرضی!“

آپریشن کی وجہ سے صبیحہ کو تین چار دن ہسپتال میں ہی رہنا پڑا۔ واعدہ کا سارا سیٹ اپ بگڑ گیا تھا۔ اماں کو ہر حال میں صبیحہ کے پاس ہی رہنا تھا۔ بچی کو سنبھالنا تھا۔ گھر پر کوئی نہ تھا۔ جو اس کے کھانے پینے کا اور دیگر ضروریات کا خیال کرتا۔ اسے آنس سے تھمتی لینا پڑ

گئی۔ صبح شام وہ ہونٹ سے کھانا لے کر ہسپتال پہنچتا تھا۔ جہاں وہ تینوں کھانا کھاتے۔ صبیحہ کا میکہ دوسرے شہر میں تھا۔ اس کے گھر والوں کو اس نے اطلاع کر دی تھی مگر تاحال کوئی نہ پہنچا تھا۔ اس روز صبیحہ کو ہاسپٹل سے ڈسچارج ہونا تھا۔ واعدہ اس کے کمرے کی طرف جا رہا تھا۔ جب اسے سجاد مل گیا۔ سجاد بھی اس کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر رک گئے۔

”ختم یہاں کیسے؟“ دعا سلام کے بعد واعدہ نے پوچھا۔

”میری بیوی ایڈمٹ ہے جینا ہوا ہے“ سجاد کا چہرہ چمک رہا تھا۔

واعدہ نے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے شاپر میں کیک کی کٹی ڈبے تھے۔

”میری بھی بیوی ایڈمٹ ہے بیٹی ہوئی ہے!“ واعدہ نے بتایا

”اچھا! مبارک ہو۔“ سجاد سرسری بولا۔

دونوں ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے۔ واعدہ کمرے میں آیا تو صبیحہ بچی کو فیڈ کر رہی تھی۔ اماں سامان سمیٹ رہی تھیں۔ انہیں سامان سمیٹنا ہوا دیکھ کر واعدہ کو خوشی اور سکون کا احساس ہوا۔ اسے کسی قید سے رہائی کا احساس ہوا۔ اس کا سوؤ خوشگوار ہو گیا۔ بچی کو ایک نظر دیکھ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ”گھر چل کر میں منٹائی لے آؤں گا۔“ عزیز رشتہ داروں میں بانٹنے کے لئے۔

”ہائیں؟“ اماں نے برا سامنہ بنایا۔ ”پہلے تم پیسے خرچ ہوئے ہیں جو ایک نیا

خرچہ سوچ رہا ہے۔ ایسی کون سی خوشیاں بری ہیں۔ لڑکیوں کی کون منٹائی بانٹتا ہے؟“

واعدہ نے صبیحہ کے بچتے ہوئے چہرے کو دیکھا اور یوں ظاہر کیا جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔

دل میں اس نے سوچا کہ واقعی خرچہ تو پہلے ہی بہت ہو گیا تھا!



وہ گھر پہنچا تو نصیر میز پر کھانے کے برتن رکھ رہا تھا۔ اسے آتا دیکھ کر نصیر نے سکون کا سانس لیا۔

”کہاں رہ گئے تھے صاحب؟ میں کب سے راہ تک رہا تھا۔“

”کہاں جاتا ہے میں نے نصیر! اس نے چھڑی جگہ پر ناکی اور نوٹی اتار کر میز پر رکھ دی۔“ یونہی ذرا پارک تک چلا جاتا ہوں۔۔۔۔۔ سیر بھی ہو جاتی ہے جوڑ بھی مل جل لیتے ہیں اور پھر دل بہل جاتا ہے۔۔۔۔۔ تم کیوں میری راہ نہتے ہو؟ کھانا کھالیا کرو۔۔۔۔۔“

”واہ صاحب! اچھی کہی۔۔۔۔۔“ نصیر نے برا مانا۔ ”دو بندے ہیں گھر میں۔۔۔۔۔ وہ بھی کھانا الگ الگ کھائیں۔۔۔۔۔ جو رہی سہی برکت ہے وہ بھی جاتی رہے۔“

”کیا پکا لیا ایسا؟“ وہ ہنسنے لگا۔ ”بڑے چمک رہے ہو؟“

”کیا پکا ہے نصیر خان نے؟“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”دن بھر میں ایک ہانڈی پکا لیتا ہوں کون سا تیر مارتا ہوں۔۔۔۔۔ آج مارکٹ گیا تھا۔ پائے اتھلے مل رہے تھے۔ سوچا لے لوں۔ دو پائے لے آیا۔۔۔۔۔ یہ ذمیر سارا سالن بن گیا ہے۔ چار دن کھائیں گے۔۔۔۔۔“

”چار دن؟ ہا۔۔۔۔۔ آ۔۔۔۔۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”تم دس دن کھاؤ یار۔۔۔۔۔ یہاں کس کو اعتراض ہے؟ جی کا بھلا وہ ہے سب۔۔۔۔۔ چار دن اور جاتے ہیں پھر۔۔۔۔۔“

آگے وہ جان بوجہ کر کھانسنے لگا تھا۔ نصیر باورچی خانے میں گیا تو وہ اٹھ کر کارز ریک تک چلا آیا۔ فریم میں جڑی تصویر میں چار بچیاں مسکراتی تھیں۔ اس نے بے اختیار ایک بچی کے رخسار پر انگلی پھیری۔ دل سے ایک ہوک انٹھی۔

”سب چل گئیں۔ سب۔۔۔۔۔ آ نکھ سے ایک قطرہ پکا اور اس کے داڑھی کے بالوں میں گم ہو گیا۔

”پاپا!“

وہ چونک اٹھا۔ جلدی سے ادھر ادھر دیکھ کر اس نے آنکھیں قمیض کی آستین سے پونچھ ڈالیں۔ نصیر آنکھوں سے اسے دیکھتا ہوا سالن کا ڈونگا میز پر رکھ رہا تھا۔

”آجائیں صاحب۔۔۔۔۔ کھانا ٹھنڈا ہو گیا تو مزہ نہیں دے گا!“

”میں مزے کے لئے کہاں کھاتا ہوں نصیر!“ وہ بھی میز تک چلا آیا۔

نون کی ٹبل بچ انہی تھی۔

”میں دیکھتا ہوں!“ نصیر اٹھنے لگا۔

”نہ۔۔۔۔۔“ وہ تیزی سے نون کی طرف بڑھتا تھا۔

رستے میں پڑی نین سے اس کے گھٹنے پر چوٹ لگی۔ پھر بھی وہ چوٹ کا براہ پیٹا

نون تک بے تابی سے پہنچا۔ ”بیلو۔۔۔۔۔“ اس نے ریسور اٹھایا۔

”پاپا۔۔۔۔۔“ یہ آواز اس نے چند لمحوں میں سنی تھی

”سفیہ بیٹی۔۔۔۔۔ کیسی ہو!“ اس کی آواز میں خوشی تھی اور درد کا احساس بھی۔

”میں ٹھیک ہوں پاپا۔۔۔۔۔ آپ کیسے ہیں؟“

”فرسٹ کلاس۔۔۔۔۔ خوش باش۔۔۔۔۔ آہ!“ اس نے گھٹنا تھما۔

”یہ آپ کراہ کیوں کر رہے ہیں۔۔۔۔۔“ وہ فکر مند ہو گئی۔ ”طبیعت تو ٹھیک ہے

آپ کی؟ پھر سے بخار تو نہیں ہو گیا۔“ ”نہیں نہیں۔۔۔۔۔ بس وہ ذرا سائیز کا کونا لگ گیا ہے

گھٹنے میں۔۔۔۔۔ میں ٹھیک ہوں!“

”اوہ پاپا۔۔۔۔۔ آپ بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے۔ یہ میز کہاں سے آگئی گھٹنے تک؟

آپ ہی دیکھ کر نہیں چلتے۔ اب کتنے دن درد رہے گا۔ پہلے ہی ہڈیوں کا پرابلم ہے آپ

کو۔ پاپا آپ بالکل اپنا خیال نہیں رکھتے۔ یہ نصیر کہاں ہے؟ آپ اس سے کیوں نہیں کام

کرواتے؟“

”اوہو۔۔۔۔۔ بچے کیوں فکر کر رہی ہو۔۔۔۔۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔۔۔۔۔“

”پاپا۔۔۔۔۔ مجھے بہت فکر رہتی ہے آپ کی۔۔۔۔۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”اچھا۔۔۔۔۔ بچے کیسے ہیں؟“ اس نے موضوع بدلا۔ ”مجھے یاد کرتے ہیں؟“

”بہت یاد کرتے ہیں۔ ریا تو ہر وقت آپ کی باتیں کرتی ہے۔“

”اور چھوٹو؟“

”وہ بھی۔۔۔۔۔“ وہ مختصر ابولی۔

”آکب رہی ہو۔۔۔۔۔ آکر مل جاؤ باپ سے۔“ اس کا مدعا پکا خرابیوں تک آئی گیا۔

”میں آؤں گی پاپا۔۔۔۔۔ بہت جلد۔“

”اچھا بیٹی۔۔۔۔۔ اللہ حافظ!“

اس نے نون بند کر دیا اور آنکھوں میں آتی نمی صاف کرتا میز تک چلا آیا۔

اچانک ہی اسے بہت بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ نصیر کے بنائے ہوئے پائے اس نے بے

حد شوق سے کھائے اور تعریف بھی کی۔



آفس میں اس نے دو طرح کا رویہ بے حد شدت سے محسوس کیا۔ سجاد کو بھی لوگوں نے بہت پر جوش انداز میں مبارک باد دی تھی۔ مثنائی کے تقاضے ہوئے تھے۔ دوست احباب اس کے گھر پھل لے کر پہنچے تھے۔ جبکہ واجد کے ساتھ سب کا رویہ یونہی سرسری سا تھا۔ بیٹی کی مبارک باد اسے سب نے دے دے سے انداز میں اس طرح دی جیسے اس کے برامان جانے کا خدشہ ہو۔ کسی نے اس سے مثنائی کی فرمائش نہ کی۔ کوئی دوست اس کے گھر نہ آیا۔ واجد کو اب سے پہلے کبھی اس بات کا خیال نہ ہوا تھا۔ صبیحہ کی پریکٹسی کے دوران اس نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ اس کے ہاں لڑکا ہونا چاہئے یا لڑکی۔ صبیحہ اکثر اس سے پوچھا کرتی کہ اس کی کیا خواہش ہے۔ وہ ہنس کر خاموش ہو جایا کرتا۔

لیکن پہلی بچی کی پیدائش پر ہی معاشرے کا جو رد عمل اس کے سامنے آیا اس سے اس کے دل میں بیٹے کی خواہش ابھری پھر چند ہی دنوں میں ایک نفل سے تادور درخت کی صورت اختیار کر گئی۔ صبیحہ کی پیدائش سے جھک جانے والے کاندھوں کو افکار چلنے کا جی چاہئے لگا۔ ”خواہش تو مجھے بھی ہے واجد.....“ وہ بولی ”لیکن ڈاکٹر کہتی تھی آپریشن کے بعد گپ زیادہ ہونا چاہئے۔ آئندہ ہم اس ڈاکٹر سے کیس نہیں کروائیں گے.....“

صبیحہ خاموش ہو گئی۔ بیٹی پیدا کر کے وہ بھی خود کو مجرم سا محسوس کرتی تھی۔ اس نے واجد کی فرمائش کے سامنے زیادہ جرح نہیں کی۔

چند ماہ میں نتیجہ سامنے آ گیا تھا۔ دونوں میاں بیوی خوش ہو گئے۔ نئے سرے سے خواب بننے لگے۔ اماں کے نحیف و نزار وجود میں بھی دوبارہ جان پڑ گئی۔ وہ دوزی بھاگی کسی مولوی سے تعویذ بنوالائیں اور صبیحہ کے گلے میں ڈال دیا۔ صبیحہ وہ تعویذ پا کر بے حد خوش ہوئی۔ گویا مولوی نے اسے پکا پکا سر شکیٹ دے دیا تھا۔ گویا وہ لڑکے کی ماں بن گئی تھی۔

اماں اور صبیحہ نے سارے کپڑے خٹے بنوائے۔ بھلا لڑکا کہاں لڑکیوں کی سی فراکیں پہن کر اچھا لگتا اماں ہر دکان دار سے لڑکے کی استعمال کی اشیاء طلب کرتیں۔

”ارے یہ لال ٹوپا کیوں دے رہا ہے بھائی..... بلکے رنگ کا دے۔“

”یہ گڑیوں کی چھپائی والا کپڑا؟ میں بچے کی چادر گڑیوں والی بناؤں؟“ دماغ

درست ہے؟“

صبیحہ واجد کو انکی باتیں بتاتی۔ دونوں میاں بیوی خوب ہنستے۔ چھوٹی سفید قدم قدم چلنے لگی تھی۔ وہ واجد کے آگے پیچھے پھرا کرتی۔ واجد کو اس سے کچھ زیادہ لگاؤ نہ تھا۔ وہ دن بھر میں ایک آدھ مرتبہ اسے گود میں اٹھا کر پیار کر لیا کرتا تھا پھر جیسے اس کا فرض پورا ہو جاتا تھا۔ کبھی وہ باہر جانے کی ضد کرتی۔ اسے واجد کی گود میں چڑھ کر محلے کے دکان سے چیز خریدنے کا بے حد شوق تھا۔ واجد نے کبھی اس کی یہ فرمائش پوری نہ کی۔ اسے سفید گود میں لے کر باہر لے جانے میں شرم محسوس ہوتی تھی۔

”لڑکا ہوتا تو لے بھی جاتا۔“ وہ دل میں سوچتا ”خیر تو ہوتا“

سفید ڈیڑھ برس کی بھی نہ ہوئی تھی۔ جب ثانیہ چلی آئی۔ وہ بھی میزورین کا نتیجہ تھی۔ واجد اور اماں دم بخود رہ گئے۔ واجد کا جی چاہ رہا تھا یہ اطلاع سنانے والی نرس کی پٹائی کر ڈالے۔ بہت دیر تک وہ جھکے ہوئے کاندھ سے اور ستا ہوا چہرہ لے کر بیٹھا رہا۔ اماں ٹھنڈی آد بھر کر بچی کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئی تھیں۔

بچی لڑکوں والے کپڑے پہنے بلکے رنگ کی چادر میں لپیٹ کر سڑے سے مسکرا رہی تھی..... اپنی ”سر پرائزنگ“ آمد پر یا ان لوگوں کے بے بسی پر یا اوپر والے کی مصلحت پر..... جانے کس بات پر!



واجد کو اس مرتبہ بہت ایسی ہوئی تھی!

عشاء کی نماز پڑھ کر دو صحن میں چلا آیا۔ وہاں کبھی چار پٹائی پر لیٹ کر تارے گننا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ آسمان کو دیکھ کر اسے عجیب سا احساس ہوتا تھا۔ چاند تارے سفید جالی کے سے نرم نرم باریک بادل جو کبھی چاند کا چہرہ ڈھانپ دیتے، کبھی گھول دیتے۔ اسی آسمان تلے اس نے عمر بیتی بھی دی تھی اور اسے خبر بھی نہ ہوئی تھی!

اسے آسمان پر اماں نظر آتیں۔ مسکراتی ہوئی، اسے اشاروں سے اپنے پاس بلاتی ہوئی اماں..... پھر اسے صبیحہ نظر آتی۔ اداس اداس مسکراہٹ والی صبیحہ۔ اس کی نگاہوں میں

ایک نامحسوس سی شکایت ہوتی۔ وہ اسے پاس نہ بلاتی تھی۔ بس دلی دلی مسکرائے جاتی۔ غمزدہ سی مسکراہٹ۔

اسے احساس ہوتا ایک دن اس کا چہرہ بھی اس طرح آسمان کا کوئی درپچہ کھول کر جھانکتا ہوگا۔ وہ بھی نیچے دیکھ دیکھ کر مسکرائے گا۔ اشارے کرے گا.....

”کون سمجھے گا میرے اشارے؟“ اسے خیال آتا ”کس کے لئے جھانکوں گا میں؟“ فریم میں جڑی تصویر میں مسکراتے چار چہرے اس کی نگاہوں میں پھر گئے۔ اس کے لبوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ چلی آئی۔ اس نے آنکھیں موندیں تو دو قطرے اس کی گردن تک چلے گئے۔ اسے ثانیہ کی یاد آئی۔ سفید بیاہ کر دوسرے شہر گئی تھی۔ لیکن ثانیہ یہیں اس شہر میں تھی۔ وہ اکثر آیا کرتی تھی۔ اس کے تین بچے تھے جو گھر میں اوجھم طوفان بچا ڈالتے۔ دو بیٹے ایک بیٹی۔ اسے ثانیہ کی سب سے چھوٹی اکلوتی بیٹی لانا بہت عزیز تھی۔ وہ اسے اٹھائے اٹھائے پھرتا۔ اس کا منہ چومتا۔ وہ اس سے بھاگتی تھی۔ اسے دیکھ کر چیخنے لگتی۔ اسے اپنے تاتا کچھ خاص پسند نہ تھے۔ لڑکے شرارتی تھے۔ وہ اس کی چیزیں چھیڑا کرتے۔ وہ اکثر انہیں ڈانٹ دیا کرتا تھا۔ ”ایک تو یہ لڑکے..... کتنے شریر ہوتے ہیں.....“ وہ اکثر عاجز ہو کر کہتا اسکی بیٹیاں ہٹا کرتی تھیں!



رات گئے اس کی طبیعت خراب ہو گئی۔ سینے میں درد اٹھنے لگا۔ اس نے نصیر کو دو چار آوازیں دیں تو وہ آنکھیں ملتا چلا آیا۔

”صاحب .. خیر تو ہے.....“ وہ اس کا چہرہ دیکھ کر گھبرا گیا۔

”نصیر..... وہ میری گولیاں..... زبان کے نیچے رکھنے والی.....“ وہ ہشکل بول پایا۔

نصیر دوڑا بھاگا گیا۔ اس کی گولیاں لے آیا۔ شیشی سے گولی نکال کر اس کے منہ

میں رکھی۔ پھر اس کی پونجی سہلانے لگا۔ وہ گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ اس عالم میں اسے خدا کے بعد نصیر کی یاد آئی تھی۔ اگر وہ اس کے ساتھ ہوتی تو شاید اس تہائی اور تکلیف کا اتنا احساس نہ ہوا کرتا۔ وہ اتنا ہوتی تو وقت بالکل علیحدہ شکل کا ہوتا۔ ایک دوسرے کے سہارے وہ بڑھاپے اور تکلیف کی سب سرحدیں ساتھ ملے کر لیتے۔

نصیر کون تھا؟ محض ایک دیرینہ ملازم۔ بمبلا ملازم کے سہارے موت کی سرحد عبور کرنا کوئی آسان بات تھی؟ ایسے عالم میں تو کسی بہت ”اپنے“ کا ہاتھ ہاتھوں میں ہونا ضروری ہے! اسے اماں کے آخری وقت یاد آیا۔ اس کے دل کی دھڑکن معمول پر آنے لگی۔ پھر اسے نصیر کا..... اس کی سفید چٹکوں والی آنکھیں سلگنے لگیں۔

”صبیحہ..... صبیحہ“ اس کا دل پکارنے لگا۔

نصیر بیٹھا اس کی پشت سہارا ہوتا تھا۔

”تم جاؤ نصیر“ وہ بھٹکی آواز میں بولا۔ ”میں ٹھیک ہوں اب۔ تم آرام کرو جا کر۔“

”صاحب.....“ آپ چلے کیوں نہیں جاتے وہاں؟“ نصیر دلی دلی آواز میں بولا

”نہیں نصیر..... بہت اچھی گزر رہی ہے..... اس سے زیادہ کی مجھے کبھی خواہش

نہیں..... چار دن اور جاتے ہیں۔ اور پھر.....“ اسے کھانسی آ گئی۔

”تم جاؤ نصیر!“

اس کے اصرار پر ناچار نصیر وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اسے

صبیحہ کی یاد آ رہی تھی۔ وہ تنہائی میں صبیحہ سے کچھ باتیں کرتا چاہتا تھا۔

زندگی میں اسے صبیحہ سے کچھ زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ ملا تھا۔ وہ اماں کی پسند

تھی۔ شادی سے پہلے دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ شروع

شروع میں اس سے کترایا کرتا جھینپا جھینپا سا رہتا۔ اماں کا میاں بیوی کا سر جوڑے رہنا پسند

نہ تھا۔ نہ ہی وہ بیوی کا زیادہ دیر میاں کے پاس بیٹھنا پسند کرتی تھیں۔ سو آنکس سے لوت کر

وہ اکثر دوستوں سے ملنے باہر چلا جاتا۔ صبیحہ گھر کے کاموں میں مصروف رہتی۔ بچہ بچوں کی

پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا تو وہ اور بھی مصروف ہو گئی۔ واجد سر پر آ پڑنے والی ذمہ داریوں

میں گم ہو گیا۔

دونوں نے شناسا اجنبیوں کی مانند سفر گزار دیا۔ انہوں نے ایک دوسرے کو نہ جانے

یاد ریافت کرنے کی کوشش نہ کی۔ انہوں نے آنکھوں میں بجھے ہوئے دیے جلانے کی کوشش

نہ کی۔ نگاہوں کے پانیوں پر سبز کر کے دل کے خزانے تک پہنچنے کی زحمت نہ کی۔

اسے اب اکثر خیال آتا تھا۔ غلطی اس کی تھی۔ ذات سے ذات تک کا سفر شروع کرنے میں پہل ہمیشہ مرد کو کرنی چاہئے۔ صبیحہ بات کا آغاز نہ کرتی۔ خاموشی سے اس کا استری شدہ جوڑا نکال کر عامل خانہ میں لٹکا دیتی وہ نہبا دھو کر کمرے میں آتا تو گرم گرم کھانا اس کا منتظر ہوتا۔ وہ کھانا کھاتا۔ صبیحہ اس دوران کمرے میں ایک دو چکر لگا جاتی۔ اگر وہ اس سے بات کرتا تو وہ خوشدلی سے مسکرا مسکرا کر جواب دیتی۔ اور اگر وہ دفتر کی کسی الجھن میں گم خاموشی سے کھانا کھائے چٹا جاتا تب وہ بھی اسے مخاطب نہ کرتی۔ شاید اس نے نکاح نامے میں اپنی ذات کے تمام تقاضوں سے دستبردار ہونے کی شرط بھی از خود لکھ لی تھی۔ اور چپکے سے اس پر تسلیم ختم کر لیا تھا۔

اسے اب اکثر اپنی غلطی کا احساس ہوتا تھا۔ اسے زرخیز مٹی ملی تھی۔ اس نے کبھی اس پر گلستان سجانے کی کوشش نہ کی۔ عورت فطرتاً محبوب ہوتی ہے۔ واجد نے کبھی اس کے اس جذبے کی تسکین کرنے کی کوشش نہ کی۔ روٹی، کپڑا، مکان اور دیگر ضروریات کی فراہمی..... اس نے صبیحہ کا اتنا ہی حق سمجھا۔ حق کے علاوہ عورت کا مان بھی بہت کچھ ہوتا ہے اس نے احساس نہ کیا۔

محسن میں بے مقصد لیت کر لمبی راتوں کو تمام کرنے کی کشت میں اسے اب اکثر یہ خیال ستاتا تھا۔ اس نے کبھی صبیحہ کے ہمراہ چاندنی راتیں باتیں کر کے بتانے کا اہتمام کیوں نہ کیا۔ اس نے تو کبھی صبیحہ سے اتنا بھی نہ کہا۔

”دیکھو صبیحہ! پورا چاند کتنا خوبصورت لگ رہا ہے..... بالکل تمہاری طرح!“

اب اسے وہ سب باتیں یاد آتی تھیں جو اس نے کبھی صبیحہ سے نہ کیں۔ جو باتیں اس نے چند سالوں کی ہم سفری میں صبیحہ سے کیں وہ اسے بالکل یاد نہ تھیں۔ بھلا وہ باتیں کہاں یاد رہ جانے کے قابل تھیں؟



”دو..... ڈاکٹر... آپ کو بلا رہی ہے!“ صبیحہ شرماتی، جھجکتی لیڈی ڈاکٹر کے چیمبر سے نکل کر اس کے قریب آ کر بولی تھی۔

”مجھے؟“ واجد کو حیرانی ہوئی۔ ”مجھے کیوں بلا رہی ہے؟“

”پتہ نہیں!“ صبیحہ بولی۔

لیکن اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھا کہ اسے پتہ تھا۔ واجد کو کونفٹ ہوئی۔ عورتوں سے بات کرنے کے معاملات میں وہ صفر تھا۔ اسے تو کبھی اپنی بیوی سے بات کرنا نہ آئی تھی۔ بمشکل دو ڈاکٹر کے چیمبر میں جا کر اس کے مقابل بیٹھا۔

”مسٹر واجد... سوا دو سالوں میں تین میجر آپریشن! اس کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟“ ڈاکٹر خوشمکمل نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے گویا ہوئی۔ ”آپ کو اپنی بیوی کی زندگی عزیز نہیں ہے کیا؟“

”جی... دو.....“ اس سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔

”پڑھ لکھے شخص ہیں آپ... آپ کو تو سب باتوں کا پتہ ہونا چاہیے۔ دو سیزیرین کے بعد آپ کو کم از کم تین سے چار سال کا گیپ درکار تھا۔ اس پریکٹس سے آپ کی سز کو سخت نقصان پہنچنے کا احتمال ہے..... ارے ابھی تو اس کے اسٹیلز بھی پوری طرح سے خشک نہیں ہوئے....“

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

”بہر حال... ایک زندگی کی بنیاد پڑ گئی ہے... میں اسے ختم کرنے کا مनाव تو اپنے سر نہیں لے سکتی لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ اس تیسرے آپریشن کے ساتھ ہی آپ بچے بند کروانے کا آپریشن بھی کرالیں۔ اس عورت میں مزید سکت نہیں ہے“

واجد کو ڈاکٹر کی بات بے حد بری لگی لیکن اس نے وہاں کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ صبیحہ کو لے کر گھر آ گیا۔

”بچہ کیا سوچا آپ نے؟“ صبیحہ نے پوچھا تھا۔

”سو پہلی گے..... اس نے بات نال دی۔

سفید اور ثانیہ کے بعد وہ کم از کم دو بیٹے چاہتا تھا۔ بچے بند کروانے کا مطلب تھا زیادہ سے زیادہ ایک بیٹا..... اور پھر اس مرتبہ بنانے کیوں اسے وہم تھا کہ صبیحہ پھر لڑکی کو جنم دے گی۔ وہ کوئی رسک مول لینے کے موڈ میں نہ تھا۔ اماں پوتا نکالنے کی آرزو جی میں لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنی رخصت کے سے اس کے دل میں بھی اس کی خواہش یونہی سسکتی رہ جائے۔ وہ بیٹے کا باپ بننا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش جنون بن چکی تھی۔ اس نے کیس کی ایسی ڈاکٹر سے کروانے کا فیصلہ کیا جو اسے ایسا برا مشورہ نہ دے!

”بیٹی ہوئی ہے!“ سسر نے اطلاع دی۔

وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس سے سراٹھا کر یہ جملہ کہنے والی کو دیکھا تک نہ گیا۔

”آپ کی سز کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بلڈ کا اریج منٹ کریں!“

اس مرتبہ اس نے چونک کر سراٹھایا۔ اس کا جی چاہتا تھا وہ کچھ دیر دیں اسی کیفیت میں بیٹھا رہے کوئی اس سے بات نہ کرے۔ اسے کسی کی بات کا جواب نہ دینا پڑے۔ اسے اٹھنا نہ پڑے، چلنا نہ پڑے کوئی صبیحہ اور اس کی بچی کو اٹھا کر گھر پہنچا دے۔ وہ کسی کا ذمہ دار نہ ہو۔

لیکن ایسا ہونا ممکن نہ تھا۔ اپنے کہنے کا ذمہ دار وہ خود تھا! سو وہ ہمت کر کے اٹھا اور بھاگ دوڑ میں مصروف ہو گیا۔

صبیحہ ہوش میں آ کر بہت روٹی تھی۔ اس نے بچی کو دیکھنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ واجد صبیحہ کی جانب دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہ اس سے ضرور نا بات کر رہا تھا گویا سب کیا دھرا اسی کا تھا۔

بچی صبیحہ کی گود میں آئی تو صبیحہ کے دل کو قرار آ گیا۔ وہ اپنی سب تکلیف بھلا کر اسے دودھ پلانے لگی۔ اور بچی کا پیٹ بھر جانے پر اس نے غلطی سے اس کا منہ بھی چوم لیا۔ پھر واجد کو دیکھ کر وہ خفیف سی ہو گئی۔ واجد کو اپنے رویے کی بد صورتی کا بلاخر کچھ احساس

ہوا۔ وہ اٹھ کر صبیحہ کے قریب چلا آیا۔

”ارے..... یہ تو بہت پیاری ہے!“ وہ بولا۔

صبیحہ ہنس دی۔ بچی بے حد صحت مند اور خوبصورت تھی۔

”اس کا نام کیا ہو؟“

”حزرا!“ صبیحہ ہنس دی۔ ”ہر مرتبہ میں یہی نام سوچتی ہوں۔ اماں کی خواہش تھی تا!“

”اچھا! تو حتمی رکھ لیتے ہیں۔“ واجد بولا۔ ”اماں کی خواہش کچھ تو پوری ہو.....“

دونوں میاں بیوی ہنس دیئے تھے۔

”میں نے ڈاکٹر سے بات کی ہے صبیحہ.....“ واجد کچھ دیر ٹھہر کر بولا تھا۔ ”وہ پہلی

ڈاکٹر تو یونہی کہو اس کر رہی تھی۔ یہ ڈاکٹر کہتی ہے چھ آپریشن بھی ہو سکتے ہیں..... سائنس نے

بڑی ترقی کر لی ہے۔“

”پتا نہیں واجد..... مجھے ذر بہت لگتا ہے..... شاید میری قسمت میں جینا دیکھنا نہیں

ہے!“ صبیحہ اداسی سے بولی۔

”کیوں نہیں..... مایوس کیوں ہوتی ہو..... اگلی مرتبہ جینا ہی ہوگا..... مجھے یقین ہے!“

”اگلی مرتبہ!“ صبیحہ سہم گئی۔

پھر اس نے سر جھکا لیا تھا۔



اس کی طبیعت ساری رات خراب رہی تھی۔ ساری رات وہ جاگتا رہا تھا۔ روتا رہا

تھا۔ بنانے کیوں اسے صبیحہ یاد آتی تھی تو وہ رونے لگتا تھا۔ وہ خود کو مجرم تصور کرنے لگتا تھا۔

ہر چند کہ صبیحہ نے آخری دم تک اس سے کبھی کسی بات کی شکایت نہ کی تھی۔ اسے وہ سب یاد

آتا جو صبیحہ نے اسے دیا تھا۔ اپنی زندگی کی بہترین سال بے مثال رفاقت بے لوث خدمت

اپنی صحت اپنی زندگی اور اولاد! صبیحہ نے اسے سب کچھ دیا تھا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کرتا

کہ اس نے جواب میں صبیحہ کو کیا دیا؟ اسے کچھ یاد نہ آتا۔ وہ تو اسے جتنی تحفظ تک نہ دے

پایا تھا۔ صبیحہ خود کو غیر محفوظ تصور کرتی تھی کیونکہ وہ ہر مرتبہ بیٹی کو جنم دیتی تھی اور واجد کو بیٹے کی خواہش تھی۔ اس نے اٹھ کر فجر کی نماز کے لئے وضو کیا۔ اس کی آنکھیں چلنے لگیں۔ وہ آنکھیں ساری رات سلی تھیں۔ کمرے میں آ کر اس نے جی جلائی اور حسب عادت ریک میں رکھی تصویر تک چلا آیا۔ سفید ٹائیہ چھنی اور رونا۔ اس نے محبت سے ان چاروں کو دیکھا۔ سبھی خوبصورت تھیں۔ لیکن سب سے چھوٹی رونا! وہ بو بہہ اپنی ماں کی تصویر تھی۔ جیسے صبیحہ نے دوسرا جنم لے لیا ہو۔ اسے سب ایک سی عزیز تھیں وہ ہمیشہ یہی کہتا تھا لیکن اس کا دل چپکے سے بے ایمانی کرتا۔ رونا رونا پکارے جاتا۔

اس کا جی چاہا وہ رونا کی پیشانی پر بوسہ دے۔ اسے محبت نے تڑپا کر رکھ دیا۔ رونا تو سب سے دور تھی وہ بیاہ کر انگلینڈ گئی تھی۔ سفید دوسرے شہر میں تھی۔ ٹائیہ اور چھنی یہیں اسی شہر میں تھیں۔ فرمت ملنے پر دوڑی آتی تھیں۔

آنکھیں آستین سے صاف کرتے ہوئے اس نے جاہ نماز بچائی اور نیت باندھ لی۔ خدا کے حضور حاضر ہوتے ہی سب کچھ دھندلا گیا۔ خواب و خیال ہو گیا۔ بس خدا تصور باقی رہ گیا۔

جب عمر کی نقدی تمام ہونے لگے تو زندگی کے سبھی دھندے بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ سب خواہشیں طاق نسیاں میں دھرے بے کار پرانے چراغوں کی مانند اپنی قیمت کھو چکی ہوتی ہیں۔ کسی شے کی کچھ اہمیت باقی نہیں رہتی۔ سکندر دنیا سے کیا لے گیا؟

نماز پڑھ کر اس نے ہاتھ بلند کئے تو روشن چمکتی پیشانیاں پھر سے یاد آئیں۔ اس نے اپنی اولاد کے لئے بڑے خشوع و خضوع سے بہت سی دعائیں مانگیں۔ ڈھیر سی خوشیاں نعمتیں رحمتیں برکتیں وہ سبھی کچھ مانگتا چلا گیا۔

جاہ نماز لپٹ کر اس نے جگہ پر رکھ تو گھٹنے کا درد پھر سے پریشان کرنے لگا۔

”یہ اخیر عمر کی چونیس“ وہ گھٹنا سہلاتے ہوئے سوچنے لگا۔ ”کم بختیں کتنی وفا

شعار بنتی ہیں ارے یہاں کون ہے تمہاری ناز برداری کے لئے۔۔۔ جاؤ چھوڑو میری جان!“

وہ اٹھ کر پھر ریک تک چلا آیا۔ یکا یک اس کی نگاہ کلینڈر پر جا ٹھہری۔ اس کا دل لمحہ بھر کو دھڑکنا بھول گیا۔

”پندرہ اکتوبر؟ میں بھول گیا؟ میں کیسے بھول گیا؟ آج پندرہ اکتوبر ہے۔ اور میں بھول گیا؟“ آج صبیحہ کی پچیسویں برسی تھی۔

”آؤ!“ اس کے دل میں پھر نہیں اٹھی۔

رات والا درد جو بے حد مشکلوں سے گیا تھا پھر سے لوٹنے لگا۔ آج کا دن تو بہت گزرتا تھا۔

صبیحہ کی یاد اسے ہل ہل نرپاتی تھی۔ اس کا جانا اب تک تمام جزئیات سمیت اس کے حافظے میں درج تھا۔

اسے آپریشن تھینز لئے جا رہے تھے۔ اسٹریچر ذرا کی ذرا واجد کے نزدیک رکھا تھا۔ زرد رو صبیحہ کی آنکھوں میں نبجانے کیوں آنسو تھے۔

”واجد۔۔۔۔۔ میری بچیوں کا خیال رکھنا!“ وہ بس اتنا ہی بولی تھی۔

واجد نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن اسٹریچر آگے بڑھ گیا تھا۔ واجد کے دل پر گھونسا پڑا تھا۔ وہ کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند کاندھے جوکائے وہیں کھڑا رہا تا وقتیکہ ایک نرس نے آ کر اسے اس کی زندگی کی بدترین خبر سنا دی۔ اس مرتبہ صبیحہ زندگی کی بازی ہار گئی تھی۔ بے ہوش ہونے کے چند لمحوں بعد ہی اس کے دل کی دھڑکن رک گئی تھی۔

”اس عورت میں اتنی سکت نہیں ہے۔“ ایک ڈاکٹر کے کہے ہوئے الفاظ پھر ساری عمر اس کے کانوں میں گونجتے رہے۔

وہ جانتا تھا۔ اپنی جنونی خواہش کے ہاتھوں اس نے اپنی صبیحہ کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ وہ اس کا قاتل تھا۔ وہ مجرم تھا۔

بر سال صبیحہ کی برسی پر وہ اپنے جذبات کا نئے سرے سے شکار ہوتا تھا!



دھڑ سے دروازہ کھلا تھا۔ وہ اچھل کر رہ گیا۔

”پایا..... السلام علیکم.....“ کورس میں کہا گیا تھا۔ ”سر پرائز.....“

وہ دم بخود رہ گیا۔ زندگی کے سبھی رنگ ایک ساتھ چمک اٹھے تھے۔ خوشیوں نے

ایک ساتھ اس کے گھر کا رستہ دیکھا تھا۔ ان سب کو اپنی ماں کی برسی یاد تھی۔

وہ چاروں اپنے بچے لئے چلی آئی تھیں۔

سفیہ، ربیہ اور چھوٹو کو لئے ہوئے تھی۔

ثانیہ، رائیہ، عمر اور اشعر کے ساتھ تھی

حمنی کی گود میں مریم تھی۔

اور رمنا کی گود میں فہد تھا۔

وہ بھیکتی آنکھوں کو پیچ پیچ کر کبھی کسی کو دیکھتا، کبھی کسی کو۔ اس کی ہنسی روکے نہ سکتی

تھی وہ چاروں اس پر جھک گئی تھیں۔ اس کے بال اس کی داڑھی کو چوم رہی تھیں۔

سفیہ دوڑ کر آئیوڈکس اٹھا لائی تھی اور اب اس کے گھٹنے پر مالش کر رہی تھی۔

ثانیہ گرم پانی کی بوتل لینے دوڑ گئی تھی۔ حمنی اور رمنا کھانا گرم کر رہی تھیں۔ ان

کے بچے پورے گھر میں طوفان مچا رہے تھے۔

اودہ وہ چاروں اور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ ہنس رہا تھا۔ اس کے گلستان میں بہار

آئی ہوئی تھی۔ اس کی بلبلیں چمک رہی تھیں اور تیلیوں کے سبھی رنگ اس کی آنکھوں میں

چمک رہے تھے!



ایسی عورت

دروازے کی کنڈی بجی تو بلو پر بے دھیانی میں ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی ماہ بانو چونک اٹھی اس قدر بھری دوپہر میں نجانے کون آ گیا تھا۔ وہ غنودگی کے زیر اثر بال سمیٹتی دروازے تک چلی آئی اور کنڈی گرا کر دروازہ کھولا۔ پھر وہ جھجک کر پیچھے ہٹ گئی۔

نگاہوں میں ہوس اور ہونٹوں پر بھیگی بھیگی مسکراہٹ سجائے مرید باہر کھڑا تھا۔ دروازہ کھلنے پر اس نے بناء جھجکے چہرہ اندر گھس لیا تھا۔ وہ اسے بے باکی سے تک رہا تھا۔

”جج..... جی..... جی..... وہ گھبرا کر خود میں سمٹنے لگی۔“

”بلو؟“ وہ مسکراہٹ مزید گہری کر کے بولا۔

پیلے دانت نمایاں ہو گئے۔ نگاہوں کی ہوس مزید چمکنے لگی۔

”بلو تو سو رہا ہے!“ وہ آہستگی سے بولی۔

”اٹھا کر لے جاؤں؟“ وہ سرگوشی میں بولا۔

ماہ بانو نے گھبرا کر سر اٹھایا تھا۔ نجانے اس نے بلو کے لئے ہی پوچھا تھا

یا.....

”مم... میں لا دیتی ہوں۔“ وہ بولی اور مڑ کر بستر تک چلی آئی جہاں دو سالہ بلو

مخو خواب تھا۔ ماہ بانو نے اس کے ماتھے پر سنے بال سمیٹے اور اسے بہت احتیاط سے اٹھایا سباد اس کی نیند خراب ہو جائے پھر وہ اسے بانہوں میں بھر کر دروازے تک چلی آئی۔

مرید اس اثناء میں اندر آچکا تھا۔ ماہ بانو نے بلو کو اس کی جانب بڑھایا۔ مرید

نے اپنے ہاتھوں کو پہلے ماہ بانو کے باروؤں پر پھیرا پھر اس کے چونکنے پر جلدی سے سباد کو

تھام لیا۔

”ہی ہی ہی.....“ اس نے بے وجہ ہی دانتوں کی نمائش کی تھی ”بہت سب ہے تم سے..... ہی ہی..... ببلو کو..... رہ نہیں سکتا تمہارے بغیر..... ہے نا!“

ماہ بانو کچھ نہ بولی۔ مرید کی ذلیل حرکت نے اس کے اندر چنگاریاں ہی بھردی تھیں۔ وہ نظروں کو اٹھائے بغیر خفا خفا تیروں سے مرید کے باہر نکلنے کی منتظر تھی۔

”اچھا بانو! چلتا ہوں..... کنڈی لگا لے..... ہیں!“ وہ مسکراتا ہوا باہر نکلا۔

اس کے جانے کے بعد ماہ بانو نے کنڈی لگائی اور واپس آ کر بستر پر لیٹ رہی۔ کچھ دیر قبل دو پہر کا کھان کھانے سے جو نیند کا غلبہ ہو رہا تھا وہ ایک لخت ہی غائب ہو چکا تھا۔ وہ کروٹیں بدلتی رہی۔ جانے کیسا افساد تھا۔ یہ..... جانے قدرت کی کیسی ستم ظریفی تھی۔ وہ ببلو کو جس قدر چاہتی تھی اس کا باپ مرید اس کے لئے اتنا ہی ناقابل برداشت ہوتا جاتا تھا۔

مرید کی نظروں کی بوسہ کی بونٹوں کی وہ خبیث مسکراہٹ اور ہاتھوں کے تپاک غزائم اس کے لئے نئی بات نہ تھی۔ ببلو کی محبت میں وہ سال بھر سے یہ سب کچھ برداشت کئے جا رہی تھی۔ اسے ببلو کی ماں زبیدہ پر بہت غصہ آتا تھا۔ جب وہ خود ببلو کو چھوڑ کر جاتی تھی تو اسے لینے کے لئے بھی آ سکتی تھی۔ نجانے کیوں ہر مرتبہ وہ مرید کو ہی بھیج دیا کرتی تھی۔ ماہ بانو گھر پر اکیلی ہوتی تھی اور وہ وقت بے وقت آن دھمکتا تھا۔ ٹھیکل بانو کا شوہر مستری تھا۔ وہ صبح کام کے لئے نکلتا تو رات کو ہی لوٹتا تھا جبکہ مرید کی اپنی پرچون کی دکان تھی۔ وہ جب جی چاہتا دکان کا شٹر گرا کر محلے کی گلیوں میں مزگشت کرتا پھرتا۔

ماہ بانو بے اولاد تھی اور ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق وہ ماں بننے کی صلاحیت سے محروم تھی۔ اس نے ڈاکٹروں سے مایوس ہو کر خلیسوں اور دانیوں سے بھی علاج کرایا لیکن سب بے سود رہا تھا اس کی بانجھ کوکھ جری نہ ہو سکی۔ پھر وہ مایوس اور نامراد ہو کر بیٹہ رہی۔ شادی کو چھ سال ہونے کو آئے تھے جب ماما کے درد سے بوجھل بانو کو ببلو مل گیا۔ ببلو زبیدہ کی ساتویں اولاد تھا۔ اس سے پہلے زبیدہ کے تین لڑکے اور تین لڑکیاں تھیں۔ ببلو کو سنبالنے کا وقت زبیدہ کے پاس نہ تھا۔ سال بھر کا ببلو ریس ریس کرتا پوری گلی میں مارا مارا

پھرتا تھا۔

ایک روز ماہ بانو کا دروازہ کھلا پا کر وہ گھر کے اندر چلا آیا بانو جو چکی پر بیٹھی آٹا گو نند رہی تھی اسے دیکھ کر خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کی تمنا چپکے سے اس کی بہتیلی پر تیلی بن کر آ بیٹھی ہو۔ وہ جلدی سے اٹھی ہاتھ دھوئے اور جا کر ببلو کو گود میں اٹھا کر چومنے لگی۔ پھر اس نے ببلو کو نہلایا اس کے کپڑے دھو کر سکھا کر استری کر کے اسے پہنائے۔ نرم دلیہ پکا کر اس کے خالی پیٹ کو بھرا پھر سوتے ہوئے ببلو کو پیار کر کے زبیدہ کو مطلع کرنے اس کے گھر چلی گئی۔

زبیدہ بے پردا عورت تھی۔ اسے علم تک نہ تھا کہ اتنی دیر سے ببلو ماہ بانو کے ساتھ ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ ماہ بانو کو بچہ مل گیا اور ببلو کو ماں کا حقیقی پیار اور توجہ میسر آ گئی۔ سال بھر کا بچہ اس کا دروازہ پہچان گیا وہ روز گھر سے نکلتا اور بانو کے پاس چلا آتا۔ بانو اسی کی منتظر ہوتی۔ ببلو کو دیکھ کر اس کی مستاکھل اٹھتی۔ وہ اسے نہلاتی دھلاتی کھانا کھلاتی پھر پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر پھیر کر اسے سلا دیتی تھی۔

بات یہیں تک محدود رہتی تو خوب تھا۔ لیکن ایک دن ان کے معصوم پیار کی بھنگ شیطان کے کانوں میں پڑ گئی۔ محبت کی شیرینی میں دوس اور نفرت کی کڑواہٹ کھلنے لگی۔ ایک دن مرید ببلو کو لینے آ گیا۔ گرمی کے خیال سے بانو نے گلی میں کھتا دروازہ داکر کے آگے پردہ لٹکایا ہوا تھا۔ خود وہ نہا کر نکلی تھی۔ ٹھیکے بال سکھاتی بے پردا بانو تب چونکی جب اس نے پردے کے عقب سے مرید کی مکروہ نگاہوں کو دیکھا۔ وہ نجانے کب سے وہاں کھڑا اسے توجہ سے بال سکھاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

مرید ببلو کو لے کر چلا گیا۔ اور بانو کی پرسکون زندگی میں اضطراب کی لہریں چھوڑ گیا۔ اب وہ روز ہی ببلو کو لینے آن دھمکتا تھا۔ نگاہوں سے کام نہ چلتا تو وہ ایک آدھ معنی خیز فقرہ فضا میں کند گھولنے کو اچھال دیتا تھا اور موقع ملتا تو بانو کو چھو بھی لیتا تھا اور پھر بے نیازی سے مڑ جاتا۔ ماہ بانو شرم اور غصے سے بھر کر رو جاتی لیکن وہ اسے کچھ کہنے سے ذرتی تھی۔ وہ ببلو کا باپ تھا اور بانو ببلو کی محبت میں دیوانی ہو چکی تھی۔ جس روز وہ اسے نہ دیکھ پائی اس روز جیسے کائناتوں پر لوٹا کرتی تھی۔ مرید ماہ بانو کی مجبوری کو سمجھ چکا تھا اور حرام خور

گدہ کی طرح اس کے گرد چکر کاٹا کرتا تھا۔

تکلیل گھر لوٹا تو ماہ بانو مضطرب اور بے کل تھی۔ دوپہر کا واقعہ اس کی یادداشت سے محو نہ ہو سکا تھا۔ اسے بار بار اپنے بازو پر کوئی بچھوسا رہتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔

تکلیل نے کھانا کھانے کے دوران اور بعد میں ٹی وی دیکھتے ہوئے بھی اسے ذہنی طور پر غیر حاضر پایا تو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

”بانو!“ اس نے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔ ”کیا بات ہے؟ میکہ یاد آ رہا ہے؟“

”نہیں تو!“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”لے پگی! رو رہی ہے.....“ تکلیل نے اسے خود سے قریب کیا۔ ”چل بتا

اب..... کیا بات ہے؟“

”میرے نصیب!“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں اس قدر ہی بول سکی۔

”کیا ہوا تیرے نصیبوں کو؟ تو تو بڑی بھاگے وان ہے..... جس دن سے آئی ہے میری زندگی میں..... بس خوشیاں ہی خوشیاں ہیں..... روزگار کی فکر نہیں! گھر دراپنا ہے روزی میں برکت ہے..... اور کیا چاہئے؟ تو کیوں فکر کرتی ہے!“

”اصل دولت..... جو ایک عورت اپنے مرد کو دیتی ہے..... وہی نہ دے سکوں میں.....“ وہ منہ ڈھانپ کر رو دی۔

”ری پگی..... میں نے کبھی گلہ کیا؟ کوئی شکوہ سنا تو نے کبھی میرے منہ سے؟ اور تیرے اختیار میں جو بات نہیں اس کا گلہ تجھے سے کیوں کروں؟“

”پھر بھی تکلیل..... اپنے ہاں ایک بچہ ہو جاتا..... ہر طرح سے سکھی ہو جاتی میں..... یوں دوسروں کے گھروں میں نہ جھانکنا پڑتا نہ دوسروں کو ہمارے گھر میں جھانکنے کا حوصلہ ہوتا.....“

”کیوں؟ کیا ہوا؟“ تکلیل مشکوک ہوا۔

ماہ بانو نے فوراً ہی آنسو پونچھ لئے۔ جو اگر تکلیل کو بھٹک بھی پڑ جاتی تو وہ نہ صرف مرید بلکہ بیلو کا داخلہ بھی اس گھر میں ممنوع قرار دے دیتا۔

”کچھ نہیں..... ہوتا کیا ہے.....“ وہ بولی۔ ”بس میں دن رات ایک بچے کے

لئے ترستی ہوں..... تکلیل ہم یتیم خانے سے کوئی بچہ لے لیں؟“

”پاگل ہوئی ہے!“ تکلیل جھنجھلا گیا۔ ”دوسروں کا خون ہمارا کیسے بن سکتا ہے۔ جو محبت اپنی اولاد سے ہوتی ہے اس کی بات اور ہے بے وقوف..... تو حوصلہ رکھ..... اللہ نے چاہا تو ہمارے آنگن میں بھی ضرور روشنی ہوگی۔“

”ہر مرتبہ تو رپورٹ خراب ہی آئی ہے..... یہی لکھا ہوتا ہے نا اس میں کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی..... بتا..... پھر تجھے کیسی آس ہے؟“

”اچھا چل اب سو جا!“ تکلیل ٹی۔ وی بند کر کے نیم دراز ہو گیا۔ ”زیادہ زور نہیں دیتے دماغ پر.....“

چند لمحوں میں وہ خزانے بھر رہا تھا۔ ماہ بانو حسرت سے اس کو نکلتی رہی۔ ایسی میٹھی اور ایسی سچی نیند اسے نہ آتی تھی۔ آدمی آدمی رات تک جاگتے میں اور بقیہ رات سوتے میں دو ننھے ننھے بچوں کے سنے ڈبکھا کرتی تھی..... اسے تکلیل پر رشک آتا تھا جو ہر طرح کی فکر اور پریشانی سے آزاد تھا۔ وہ تکلیل کی اس خوبی کی معترف تھی۔ جو اس کے پاس نہیں تھا۔ اسے اس کی مطلق پروا نہ تھی۔ وہ اپنے حال میں مطمئن اور خوش تھا۔ پھر ماہ بانو جی جان سے اس کی قدر بھی کرتی تھی۔ اس نے کبھی بانو کو بانجھ ہونے کا طعنہ نہ دیا تھا۔ بانو نے اس کے منہ سے یہ بات کبھی نہ سنی تھی۔ شاید یہ ماہ بانو سے اس کی بے تحاشا محبت کا ثبوت تھا۔

مجھے تیرے سوا کچھ نہیں چاہئے پگی!“ وہ اکثر اس سے کہتا۔ جب تو میرے ساتھ ہوتی تو میں ہر غم بھول جاتا ہوں..... مجھے صرف تو یاد رہ جاتی ہے۔!“

وہ ماہ بانو کا دیوانہ تھا۔ بانو کے سوا اسے کچھ بھائی نہ دیتا تھا لیکن بانو اس وقت سے ڈرتی تھی جب ہر مرد کی طرح تکلیل کے دل میں بھی وارث کی خواہش جنم لیتی۔



بیلو کے لئے اس کی محبت کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا۔ وہ جانتی تھی کبھی ماں نہیں بن سکتی تھی۔ اس کے ارد گرد مکمل اندھیرا تھا۔ بیلو اس اندھیرے میں روشنی کا احساس تھا۔ ماہ بانو بھلا کیوں نہ پروا نہ بن کر اس کے گرد ناچتی۔

اس نے مرید کی نگاہوں سے چپکٹی ہوسنا کی کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بڑھتے

ہاتھوں کی ناپاک خواہش کو وہ اکثر جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی بلوکا باپ ہونے کے ناطے وہ بلوکو کو ماہ بانو سے ملنے سے روک بھی سکتا ہے۔ لہذا وہ اس کی حرکتوں کو کڑوا کھونٹ سمجھ کر چپ چاپ پی جایا کرتی تھی۔ کھیل سے وہ اگر اس معاملے کا ذکر کرتی تو نتیجہ یہاں بھی اس کی اور بلوکو کی جدائی کی صورت میں ہی نکلتا۔ سو ماہ بانو یہاں بھی اپنے لئے کوئی راستہ نہ پاتی۔

اس روز وہ بلوکو کو سلا کر خود نہانے کے لئے غسل خانے میں گھس گئی کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلی تو اس کی نگاہ دروازے کی کندی پر پڑی۔ کندی کھلی ہوئی تھی۔ شاید جلدی میں وہ ہی لگنا بھول گئی تھی۔ وہ دروازے کی جانب بڑھی ہی تھی کہ ایک ہاتھ اس کے پیچھے سے آ کر اس کے لبوں پر سختی سے جم گیا۔ دوسرے ہاتھ سے وہ اسے گھسیٹتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔

ماہ بانو نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخیں اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھیں۔ شیطان نہانے کس رستے سے معصوم کدے میں گھس آیا تھا۔ بد قسمتی نے نہانے کس روزن سے جھانکا تھا۔ نقب کیونکر لگی تھی۔ ماہ بانو سمجھ نہ سکی۔

مرید اپنے ناپاک عزائم میں کامیاب ہو کر فرار ہو گیا تھا۔ ماہ بانو اپنا سسکتا وجود اور زخمی روح لئے تڑپتی رہی۔ گھٹ گھٹ کر روتی رہی۔ وہ ایسے مقام پر تھی کہ کسی سے دو بول بھردی کے بھی نہ مانگ سکتی تھی۔ حال دل کس سے کہتی تھیں؟ لٹنے کا مجرا کسے سناتی؟

بلوکو اٹھا تو بانو نے اسے جی بھر کر پیا کیا پھر اسے گھر سے نکال کر کندی لگالی۔ بلوکو ہی وہ روزن تھا جہاں سے لیٹرے کو گھر میں گھسنے کا اشارہ ملا تھا۔ بانو کو لٹ کر عقل آئی تھی۔ سب کچھ منوا کر خود کو محفوظ رکھنے کا خیال آیا تھا۔

کھیل کے آنے سے پہلے ہی وہ خود پر قابو پا چکی تھی۔ لیٹرے کے گھر میں در آنے کا ہر سراغ منا چکی تھی۔ کھیل کا استقبال اس نے ہمیشہ کی طرح مسکرا کر کیا۔

کھیل اس کی مسکراہٹ کی مردنی کا راز نہ جان سکا!



بلوکو روز آتا لیکن بانو اس کے لئے دروازہ نہ کھولتی۔ وہ ننھے ننھے ہاتھوں سے۔

دروازہ بجاتا۔ بانو کے کانوں میں جیسے پچھلا ہوا سیسہ گرتا۔ اس کا دل نکلے نکلے ہوتا۔ روح سسکتی۔ وہ دروازہ نہ کھولتی۔ بلوکو باہر کھڑا روتا رہتا۔ ماں! ماں! پکارتا! بانو نے اسے 'ماں' کہنا سکھایا تھا۔ بانو اندر بیٹھی رو دیا کرتی۔ اس کا رواں رواں 'بلوکو! پکارتا! پھر بھی وہ اسے اندر آنے کی اجازت نہ دیتی تھی۔ بلوکو روزن تھا اور اس معصوم روزن سے ایک شیطان کی آنکھیں اس کے گھر میں جھانکا کرتی تھیں سو بانو مجبور تھی!

یونہی کتنے ہی دن گزر گئے۔ بلوکو نے مایوس ہو کر دروازہ بجاتا چھوڑ دیا۔ باہم وہ لاچار سا گلی میں پھرا کرتا تھا۔ ماہ بانو کبھی کبھار کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ لیا کرتی تھی۔ بلوکو کی جھٹک پا کر اس کے دل میں کیل سی گز جاتی۔ وہ تڑپ کر رہ جاتی۔

اس روز کھیل کام پر نہ گیا تھا۔ اس کی طبیعت ناساز تھی۔ ماہ بانو اس کے لئے روٹی پکا رہی تھی۔ کہ یکا یک اس کو بڑے زور کا چکر آیا۔ پھر اسے تنگی محسوس ہوئی۔ وہ لپک کر مٹی اور غسل خانے میں جا کر التیاں کرنے لگی۔

کھیل اس کی آواز سن کر لپک کر چلا آیا تھا۔

”بانو..... کیا ہوا ہے بانو.....“ وہ اسے سنبھالنے لگا۔

بانو کی طبیعت شام تک نہ سنبھلی تو وہ پڑوس کی عورت کو بلا لایا جو غسل کی عورتوں کو ہلکے پھلکے امراض کی دوا دے دیا کرتی تھی۔

”اے بی! مبارک ہو.....“ دائی ماں بولی تھی۔ ”خیر سے ماں بننے والی ہو!“

ماہ بانو کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ وہ تحیر سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

”کیا کچھ رہی ہو ماں.....“ کھیل غرایا تھا۔ ”دماغ ٹھیک ہے تمہارا۔“

”اے لولا!“ دائی ماں حیران بھی ہوئی اور خفا بھی۔ ”میاں چالیس سال سے یہ کام

کر رہی ہوں۔ اس کو پیٹ نہ ہو تو جو سزا چور کی وہ میری۔“

دائی ماں بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔ ماہ بانو کا چہرہ خوشی کے مارے گھٹا ہوا تھا۔ اس نے کھیل کی آنکھوں میں اترتا ہوا خون نہ دیکھا۔

”کھیل..... کھیل..... سناتم نے..... میں ماں بننے والی ہوں..... تم

باپ بننے والے ہو.....“

”حراف!“ ٹھیکل زور سے چلایا۔ ”بتا۔۔۔ کس کے ساتھ منہ کالا کیا ہے تو نے

..... بدکار.....“

”ٹھیکل!“ ماہ بانو لرز کر رہ گئی۔ ”یہ کیا کہہ رہے ہو.....“

ٹھیکل نے ایک موٹی لکڑی اٹھائی اور اسے پینٹا شروع کر دیا۔

”جان سے مار ڈالوں گا حرام زادی..... مجھے پاگل بناتی ہے۔“ بتا کون ہے

وہ..... جس کا گناہ کھوکھ میں لئے بیٹھی ہے تو.....“

ٹھیکل پر خون سوار تھا۔ بانو جان بچاتی تھی میں نکل آئی۔ محلے والے بھی اپنے

اپنے گھروں سے نکل آئے تھے۔ ایک زمانہ اس کی رسوائی کا تماشا دیکھ رہا تھا۔

چند لوگوں نے بانو کو بچانے کی کوشش کی تو ٹھیکل نے انہیں بھی پیٹ ڈالا۔

”میں باپ نہیں بن سکتا لوگو..... سنا تم نے.....“ وہ چلا رہا تھا۔ ”میں باپ نہیں

بن سکتا اور یہ ماں بننے والی ہے..... ایسی بدکار فاحشہ کو مار نہ ڈالوں میں.....“

بانو چیخی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ وہ شخص چند سالوں سے اسے یہ یقین

دلارہا تھا کہ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی اور آج اپنی خالی کا اعتراف کر کے بھی وہ سرخ رو تھا۔

ٹھیکل لکڑی پھینک کر گھر میں گھس گیا اور اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ لوگ باتیں

بناتے، فخرے کستے اپنے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ زخمی اور مجروح بانو کی دلجوئی کو کوئی تیار

نہ تھا۔

”چل زبیدہ اندر.....“ مرید کی آواز پر بانو نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔

وہ تنفر سے اسے دیکھتا ہوا اپنی بیوی کو گھر کے اندر لے جا رہا تھا۔ اس کی نظروں

میں حقارت اور تسخر تھا۔ شاید وہ بھی اسے بدکار اور فاحشہ سمجھ رہا تھا۔

”ایسی عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے.....“ وہ زبیدہ کو گھر کے اندر لے گیا اور

بڑے زور سے دروازہ بند کر لیا۔

”ایسی عورت.....“

”ایسی عورت.....“

”ایسی عورت.....“

ماہ بانو کنٹکا بوس کے سامنے زمین و آسمان گھوم رہے تھے۔ دنیا اس کے ارد گرد
چکرارہی تھی۔ مرید جیسے شخص کی زبان سے یہ بات سننے کے بعد پھر کسی شے کی کچھ حقیقت
نہ رہی تھی۔

”ماں..... ماں.....“

بانو نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اپنے قریب بیٹھے بیلو کو پہچاننے کی کوشش کی
جو اس کے بازو پر اپنا سر رکھ رہا تھا۔

”بیلو!“ اس کے لبوں سے سسکی نکلی۔

”ماں..... ماں.....“ بیلو ہل رہا تھا۔

”بیلو.....“ ماہ بانو نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

”ایسی عورت..... ایسی عورت.....“ مرید کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”فاحشہ..... بدکار.....“ ٹھیکل چلا رہا تھا۔

”ماں..... ماں.....“ بیلو تکرار کئے جا رہا تھا۔

دور کہیں زین چلائی تھی۔ ماہ بانو نے پھلتے ہوئے اندھیرے میں ادھر ادھر دیکھا

اور بیلو کو اپنی اوزمنی میں چھپا کر چل دی!



وہ تڑپ کر وہاں سے ہٹ گئی اور کسی ہاری ہوئی جنگ کے شکست خوردہ بادشاہ کی طرح سر ایک طرف کو گرا کر کرسی پر بیٹھ رہی۔

کس قدر مطمئن ہو گئی تھی زندگی۔ وقت کی شاہراہ پر سرور و مصروف انداز میں رواں دواں تھی۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔ دسیم کی بے مہری میں واضح کی آئی تھی۔ اب وہ اکثر اس سے مسکرا کر بات کرتا تھا۔ کبھی کبھار اسے گھمانے پھرانے کے لئے باہر بھی لے جاتا تھا۔ گھر لوٹتے وقت اس کے ہاتھوں میں پھلوں کے لفافے ہوتے تھے بلکہ کبھی کبھی تو وہ پکا پکایا کھانا بھی لے آتا تھا۔ ماہرہ کو اس کو اچھے رویے کی عادت ہو گئی تھی۔ اس کا سابقہ رویہ اس کی یادداشت سے محو ہو چلا تھا۔ اور..... اور..... سال بھر ہی گزرا تھا کہ وہ پھر سے اسی کھڑکی میں نظر آ رہی تھی۔

ماہرہ کو خیال آیا۔ وہ کتنی خوبصورت دکھائی دیتی تھی۔ نیلا رنگ اس پر کس قدر اٹھ رہا تھا۔ گزرا سال اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ پایا تھا۔ وہ ویسی ہی شگفتہ اور دلکش تھی۔

پھر وہ جلدی سے انہی اور ڈریسنگ نیل کے قد آدم آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ براؤن رنگ کے کپڑوں میں اس کا بے رونق چہرہ مزید بے رونق لگتا تھا۔ اسے بے حد مایوسی ہوئی۔ حد درجہ جھنجھلاہٹ سوار ہوئی۔ اسے خود پر غصہ آیا۔ آخر اسے رنگوں کا صحیح انتخاب کرنا کیوں نہ آیا تھا۔ ہر مرتبہ کپڑوں کی شاپنگ کے وقت وہ یہ بات بھول جاتی تھی کہ اسے کس طرح کے رنگ پہننا چاہئیں۔

دل براؤن، ڈارک میرون، ڈارک گرین، بلیک، مرے، ہوئے چوہے کا ساگرے..... اسے اپنی الماری کھول کر بے حد افسوس ہوا۔ ایک سے ایک بے کار رنگ بھرا ہوا تھا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دسیم کے آفس سے لوٹنے سے پہلے نہادھو کر کوئی بہت فریش کھلتا ہوا سا رنگ پہنے۔ ایسا رنگ جس کا ٹکس اس کے چہرے کی بے رونقی کو ڈھانپ لے جو اس کے اندر کی اچھائی کو پورے طور پر نمایاں کر دے جو اسے پورے گھر میں چلتے پھرتے اس طرح نوکس کر دے کہ دسیم کو کھڑکی کھول کر باہر جھانکنے کا خیال نہ آئے۔ اگر وہ کھڑکی کھول دیتا اور سامنے والی کھڑکی میں کھڑی ٹائلڈ کو نیلے رنگ کا لباس پہنے ہوئے دیکھ لیتا تو..... تو..... آگے اس کی سوچ کی پرواز میں دم نہ رہا۔ وہ بے جان پردوں کے

Fantasy

کھڑکی کھولتے ہی وہ یوں خوفزدہ ہو کر پیچھے ہٹی تھی جیسے اس نے کھڑکی میں کسی نامن کو دیکھ لیا ہو شاید اس نے نامن کو ہی دیکھا تھا یا پھر کسی نامن کی نامن ہی چوٹی پر اس کی نگاہ پڑی تھی۔

وہ خوفزدہ ہو کر پلٹ گئی تھی اور دسیم کی رائیٹنگ نیل تک چلی آئی تھی۔ رائیٹنگ نیل پر رکھے ہوئے شیشے کے نیچے دسیم کی پاسپورٹ سائز تصویر پڑی تھی۔ ماہرہ کی نظریں تصویر میں دسیم کی نظروں سے ملیں۔ اسے یوں لگا جیسے تصویر میں دسیم کی مسکراہٹ گہری ہو گئی ہو اور اس میں معنی در آئے ہوں۔ وہ اضطراب کے عالم میں اپنی ہتھیلیاں رگڑنے لگی۔ پھر وہ خوش فہمی میں مبتلا ہو کر سوچنے لگی کہ شاید اس نے جو کچھ دیکھا وہ نظر کا دھوکہ تھا۔ شاید اس نے کسی دوسرے فلیٹ کی کھڑکی دیکھی۔ شاید اس نے غلط سمجھا، حقیقت کچھ اور تھی۔ شاید وہ ٹائلڈ نہیں کوئی اور تھی!

کیا مشکل ہے! شوہر کی محبوبہ کا سامنا کرنا کیسا اذیت ناک مرحلہ ہے..... وہی عورت سمجھ سکتی ہے جس کے شوہر کی کوئی محبوبہ ہو اور اس سے سامنا بھی ہوا ہو۔

ماہرہ ڈرتے ڈرتے پھر کھڑکی تک گئی۔ شک شبہات کے سب بلبلے ہو گئے۔ یقین کی سطح ہموار ہو گئی ٹائلڈ اپنی کھڑکی میں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا لباس پہنا ہوا تھا۔ جس میں اس کا چاندنی سا بدن دور سے بھی دھمکتا نظر آ رہا تھا۔ اس کے سیاہ بالوں کی نامن ہی چوٹی اس کے سینے پر پڑی تھی اور اس کے لبوں کی دو منہ چراتی مسکراہٹ ماہرہ کو اتنی دور سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

بوجہ کے ساتھ ماہرہ کے کاندھوں پر آگری۔

پھر اس کا جی چاہا وہ سر پر پٹی باندھ کر بستر پر پڑ جائے۔ اور اس قدر ہائے وائے کرے کہ دسم اس کے سر ہانے سے ہی نہ اٹھے۔ اس کا ذہن ماہرہ کی بیماری میں اس قدر الجھ جائے کہ اسے کھڑکی کا خیال تک نہ آ سکے..... لیکن..... لیکن..... دسم تو ذرا سی طبیعت خرابی میں سب سے پہلے تازہ ہوا کی فراہمی کے لئے وہ کھڑکی ہی کھولتا تھا۔ ماہرہ کو بستر پر دیکھ کر تو وہ ضرور سب سے پہلا کام کھڑکی کھولنے کا کرتا اور پھر وہ اس کی بیماری اور صحت سے متعلق ہر بات فراموش کر دیتا۔ شام کو دیکھ کر! پھر اسے خیال آیا کیوں نہ وہ اس کھڑکی کے پنوں میں کیلیں ٹھوک دے۔ اسے کوئی توجہ لگا کر ہمیشہ کے لئے بند کر دے..... لیکن بخیال تو سب سے زیادہ ناقابل عمل تھا! بھلا وہ اپنے اس عمل کی دسم کے سامنے کیا تو جیبہ پیش کر سکتی تھی؟

سب سے آخر میں اسے اپنی ماسٹرز کی ڈگری یاد آئی! ماہرہ کا جی چاہا کہ وہ اپنی ڈگری نکال کر دیکھے۔ آخر کیوں؟ کیوں اس نے وہ ڈگری حاصل کی تھی؟ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن ماہرہ شیخ۔ ایک قبول صورت! سانولی رنگت کی لڑکی..... جو ازدواجی زندگی کے دو سال گزارنے کے بعد بھی اپنے شوہر کی اجنبیت سے خوفزدہ تھی۔ اپنے شوہر کے گھر میں ہوتے ہوئے وہ ایک ایسی لڑکی سے خوفزدہ تھی جو محض دور سے اس گھر کی صرف ایک کھڑکی کے کھلنے کی منتظر رہتی تھی۔ موجودہ وقت پر دسترس رکھتے ہوئے وہ آنے والے وقت کے بے معنی اندیشوں سے خوفزدہ تھی..... کیوں..... کیوں.....؟

وہ ایک مرتبہ پھر آئینے کے مقابل چلی آئی اور اپنی مایوس اور خوفزدہ نظروں سے اپنا چہرہ کو بنے لگی۔ اسے احساس ہوا وہ زیادتی کر رہی تھی وہ اپنے چہرے کے ساتھ زیادتی کر رہی تھی۔ وہ اپنا چہرہ بھی اپنے نظر سے دیکھنے کے بجائے دسم کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ اسے کم از کم اپنے چہرے کے ساتھ یہ زیادتی نہیں کرنا چاہئے تھی۔ وہ چہرہ اس کا تھا! اس پوری دنیا میں وہ اپنے چہرے کو دسم کی نگاہ سے دیکھتی؟ اس کی خامیاں تلاشتی؟ اس کی خوبیوں سے نگاہ چراتی؟ دسم اگر اس میں خامیاں ڈھونڈتا ہے تو ڈھونڈتا پھرے۔ وہ اگر اس چہرے کا موازنہ شام کے چہرے سے کرتا ہے تو ہزار بار کرے..... وہ چہرہ دسم کا چہرہ تو اسی ہے جو

اسے اس چہرے سے محبت یا انس ہو۔ لیکن ماہرہ کی نگاہوں کو ایسا کرنا زیب نہ دیتا تھا۔ اس نے بہت پیار سے اپنے سانولے رخسار پر ہاتھ پھیرا۔ اور محبت سے اپنی زرد آنکھوں میں جھانکا بچپن میں وہ بہت بیمار رہی تھی یہ اس نے اپنے بزدوں سے سنا تھا۔ لمبی بیماری نے اس کے جسم کو اندر سے کھوکھلا کر ڈالا تھا۔ اور بہت لمبے عرصے کے لئے وہ سینک سلائی سی رہی تھی۔ پھر جوانی آئی تو بدن تو پھر بھی مارے خوشی کے کچھ بھر بھرا گیا لیکن چہرہ ویسا کا ویسا ہی رہا۔ وہ سانولی رنگت اور مردہ آنکھوں والی ایک ذہین لڑکی تھی۔ یونیورسٹی میں اس کی ذہانت کے چہرے تھے وہ اپنے نیچر کی منظور نظر تھی۔ لیکن نبھانے کیا بات تھی؟ وہ بہت خود اعتماد نہ تھی۔ بات کرتے، جھجکتی، لڑکوں سے کتراتے۔ شاید اس کے لاشعور میں اپنی کم روئی کا گلہ چھپا ہوا تھا۔ اسے احساس تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں کی طرح شگفتہ اور شاداب نظر نہ آتی تھی۔ پھر اسے پہننے اور سننے کا کچھ ایسا خاص ڈھنگ بھی نہ تھا۔ وہ عموماً ایسے رنگوں کا انتخاب کر لیتی تھی جو پہننے کے بعد بالکل بھی نہ اٹھتے تھے۔ شاید یہ اس کی ذل شخصیت کا کرشمہ تھا جو وہ ایسے ذل کلرز منتخب کر لیا کرتی تھی۔

اس کا جی چاہا وہ ہنستی رنگ کا جوڑا پہنے یا پھر جو گیارہ رنگ کا دوپٹہ اوڑھے یا فیروزہ رنگ کا کرتا اور سفید شلوار پہنے۔ اس کا جی فالسی رنگ پہننے کو چلا۔ دھانی رنگ پہننے کو ترپا اس کی نظر میں قوس و قزح کے رنگ چمکے۔ آہ! الماری میں براؤن اور بیرون کا راج تھا۔ گرے اور ڈارک مسزڈ رنگ کے کئی جوڑے تھے۔ وہ جو بھی جوڑا منتخب کرتی اس کے ذہن میں نیلے رنگ کے کپڑے زیب تن کیے شام کو آکھڑی تھی۔

اس کی نگاہ گھڑی پر گئی۔ دسم کے آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ اس کے پاس سوپنے کے لئے زیادہ وقت نہ تھا۔ بادل خواستہ اس نے مسزڈ رنگ کا ایک لباس منتخب کیا اور غسل خانے میں گھسنے سے پہلے مین ڈور کا لاک کھول دیا۔ دسم اگر اس کے غسل کے دوران آ جاتا تو باہر کھڑا پریشان ہوتا رہتا۔

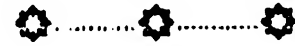
نبھانے کے دوران وہ پڑمردگی کا شکار رہی۔ اچھا بھلا سوکر ابھی تھی۔ پوری دوپہر کی نیند کے بعد ذہن تازہ دم ہو گیا تھا۔ کیفیات خوشگوار تھیں۔ وہ کمرے کی کھڑکی کھول کر کچن میں پائے بنانے کے لئے جانا چاہتی تھی۔ جب ساری خوشگوار کیفیات یکایک ہی جسم

ہو گئی تھیں۔ اور اب وہ بے دلی سے نہاتے ہوئے سوچ رہی تھی کہ دسیم سے بھلا یہ بات کتنے عرصے تک چھپی رہ سکتی تھی جلد یا بدیر اسے شامکہ کہ آمد کا علم ہو جاتا تھا پھر نجانے ماہرہ سے اس کا رویہ پھر بدل جاتا یا دیا ہی رہتا وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھی۔ ایک خوش امید یہ بھی کی جا سکتی تھی کہ شاید شامکہ کی آمد کا علم ہی نہ ہو پائے۔ یہ خیال تسکین بخش تھا! نہا کر کپڑے پہنتی ماہرہ کی کیفیات پھر خوشگوار ہونے لگیں۔ اسے چائے کی پیالی کی طلب ہوئی۔ وہ اب کچن میں جا کر چائے بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

نسل خانے کا دروازہ کھول کر وہ جونہی باہر نکلی اسے یوں لگا جیسے سانپ کی بجائے دی ناکن اسے سوجھ گئی ہو جسے اس نے کھڑکی میں دیکھا تھا! دسیم کھڑکی کھولے کھڑا تھا۔ اس کی پشت ماہرہ کی جانب تھی۔ دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکت پر جمائے وہ باہر کیا دیکھ رہا تھا! ماہرہ خوب جانتی تھی! پھر بھی دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ اس کے قریب چلی آئی۔

دسیم! آپ کب آئے؟

دسیم چونک کر مڑا۔ اس کی نظروں میں ماہرہ کے لئے اجنبیت تھی اور لیوں پر چند لمبے قبل والی مسکان کا سراغ تھا۔ ماہرہ کو اس کے عقب میں سامنے والی بلڈنگ کے اس قہیٹ کی کھڑکی نظر آئی۔ وہاں نیلے لباس کی جھلک تھی۔ اس کے لیوں سے فریاد کے سے انداز میں ایک آونگی۔ پھر وہ چائے بنانے کے لئے کچن کی جانب چل دی!



شب روز ایک مرتبہ پھر بدل گئے تھے۔ ستاروں نے شاید پھر چال بدلی تھی۔ ماہرہ کے لئے وہی دن پلٹ آئے جب وہ نئی نئی شادی کے بعد اپنی زندگی کا نئے سرے سے آغاز کر رہی تھی۔ دسیم پھر سے وہی دسیم بن گیا تھا۔ جس کے انداز میں خوشونت نگاہوں میں اجنبیت اور لہجے میں کڑھائی تھی۔ وہ آفس سے جلد لوٹ آتا اور گھر آتے ہی بے حد بے تابی سے اپنی فائل میز پر پھینکتا ہوا کھڑکی کی جانب بڑھتا۔ ماہرہ کے لٹکائے ہوئے دبیز پردوں کو وہ ایک ہی جھپٹے میں ایک طرف ہٹا دیتا اور پھر کھڑکی کھول کر گہری سانس بھرتا اور مسکراتا۔ اس کی سانس میں طمانیت اور مسکراہٹ میں جاذبیت ہوتی تھی۔ اس کے عقب میں ماہرہ بھی ایک گہری سانس بھرتی تھی۔ اس سانس میں جذباتوں کے جھٹکے کی بو ہوتی تھی۔ خوابوں کے

لوٹنے کی کراہ ہوتی تھی۔ دسیم کو نہ تو کچھ جلنے کی بو محسوس ہوتی اور نہ ہی کچھ نوٹنے کی آواز اس کے کانوں تک پہنچتی تھی۔ وہ کرسی کھڑکی کے سامنے ڈال لیتا اور پھر رات تک وہیں بیٹھا رہتا تھا۔ ماہرہ جلے پاؤں کی پٹی کی طرح کمرے کے چکر کاٹتی اور بہانوں بہانوں سے اسے مخاطب کرتی۔ اس کا دھیان بنانے کی اپنی سی سعی کیا کرتی لیکن دسیم کی توجہ سامنے والی بلڈنگ کی اسی کھڑکی کی جانب مرکوز رہتی جہاں شامکہ روز نئے نئے اور نئے رنگوں کے کپڑے بدل بدل کر سامنے پھرا کرتی۔

شامکہ کے پاس پہننے کے لئے بہت خوبصورت رنگوں کے کپڑے تھے۔ اپنی دکھتی رنگ کے لحاظ سے دوسرے جانشینی نیلا اور سبز رنگ خوب پہنا کرتی۔ وہ زیادہ دیر کھڑکی میں نہ ٹھہرتی تھی بلکہ ہر تھوڑی دیر بعد ایک جھاک دکھا کر غائب ہو جایا کرتی۔ کبھی وہ دونوں کنبیاں چوکت پر نکالیتی اور ظاہر کرتی کہ وہ نیچے روڈ پر گزرتی ٹریفک دیکھ رہی ہے۔ کبھی کنبیوں سے اور کبھی پورے طور وضاحت سے دسیم کو دکھاتی اور کبھی کبھار تو وہ بے حد شوقی کا مظاہرہ کر کے دسیم کو ایک آدھ اشارہ بھی کر دیا کرتی تھی۔ دسیم اس دن بہت خوش ہوتا تھا۔ وہ عشقیہ رویہ ماننے سنا اور پہروں سوچ میں ڈوبا مسکراتا رہتا۔ ماہرہ کچن کے روشن دان تک اسٹول کے ذریعے پہنچتی تھی اور وہاں سے شامکہ کی حرکات پر نگاہ رکھتی تھی۔ لیکن اس جاسوسی سے اسے کچھ خاص فائدہ حاصل نہ تھا کیونکہ دسیم اور شامکہ چھپ چھپا کر نہیں بلکہ علی الاعلان نظر بازی کا کھیل کھیلتے تھے۔

دسیم کو ماہرہ کا ڈر تو کیا معمولی سی مردت بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ شامکہ کو دنیا والوں کی پردہ نہ تھی یوں بھی وہ سال بھر شادی کا کھیل رچا کر معتبر بن چکی تھی۔ اب اسے "کنواری" اور "جوان جہان" لڑکی کے ٹائٹل سے نجات مل چکی تھی۔ وہ اپنے تئیں بہت "ان ڈیپنڈنٹ" خیال کرنے لگی تھی۔

ان کا یہ نظر بازی سے مزین عشق بہت نیا نہ تھا۔ یہ تب کی بات تھی جب دسیم روزگار سے بھی نہ لگا تھا۔ وہ سارا دن نیپ پر گانے لگائے کھڑکی میں بیٹھا رہتا تھا۔ شامکہ بیوہ ماں کی اکلوتی اولاد تھی۔ اسے بھی سامنے والی کھڑکی میں ایک چاند کا ٹکڑا رہتا ہے والا گانا مٹا کر گیا۔ ماں کو وہ کسی خاطر میں نہ آتی تھی۔ وہ پورنی طرح سے چاند بننے پر آمادہ ہو کر

کھڑکی کے افق پر لگی رہتی اس دہشت و سیم کی ماں زندہ تھی۔ اس نے جو بیٹے کے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوتے دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ وہ ہرگز شامک جیسی خوبصورت بلا کو گھرانے کا خطرہ مول لینا نہ چاہتی تھی جو کھلی کھڑکیوں سے پرائے لڑکوں سے تاکا جھانکی کرتی ہوں۔

ماہرہ کی ماں و سیم کی ماں کی پرانی سہیلیوں میں سے تھی۔ و سیم کی ماں نے چند ایک مرتبہ ماہرہ کو دیکھا تھا۔ وہ ایک ذہین لائق اور اچھے اخلاق کی لڑکی تھی۔ ماہرہ کی ماں اپنی بیٹی کی کم روئی سے پریشان تھی۔ رشتے آتے تھے لیکن کہیں بات نہ بنتی تھی۔ اسے و سیم کی شکل و صورت بھانگی۔ کم شکل بیٹی کے لئے خوبصورت وجہ لڑکے کا رشتہ اسے اچھا لگا۔ لڑکے کی تعلیم کم بھی تھی تو اس سے فرق نہ پڑتا تھا۔ و سیم محض بی۔ اے پاس تھا۔ ماہرہ کی ماں نے کم تعلیم اور بے روزگاری کے باوجود اپنی ذہین اعلیٰ تعلیم یافتہ بیٹی کا ہاتھ و سیم کے ہاتھ میں تھما دیا۔

و سیم کو شادی کی اولین رات ہی بے حد مایوسی ہوئی تھی۔ اسے ماہرہ کی ڈگری سے دلچسپی نہ تھی بلکہ یہ بات تو اس کے لئے باعث شک تھی کہ بیوی اس سے زیادہ پڑھی لکھی اور قابل تھی۔ پھر وہ شامک کی گوری رنگت کا مارا ہوا تھا۔ اسے سانولے رنگ کی بیوی اپنے ارمانوں کا خون محسوس ہوئی۔ پہلی رات ہی دونوں کے مابین ایک ان دیکھی خلیج حائل ہو گئی۔ ماہرہ کو سننے فوٹے دولہا کی عدم دلچسپی کی وجہ جلد ہی سمجھ آ گئی۔ و سیم سارا دن کھڑکی میں لٹکا رہتا۔ شامک اپنے رنگ برنگ آئین لہرایا کرتی۔ و سیم ہاتھ جوڑ کر معافیاں مانگتا۔ وہ جواباً انگوٹھا دکھاتی۔

پڑوس کی لڑکی عظمیٰ جب ماہرہ کی دوست بنی تب اسے پورے اور اصل قصے کا ٹھیک ٹھیک علم ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ جان کر بے حد افسوس ہوا تھا۔ اس کے خیال میں و سیم کی ماں نے اس کے ساتھ زیادتی کی تھی۔ بیٹا قابو میں رکھنے کے لئے اس نے ماہرہ کو قہر بانی کا کبرا بنایا تھا۔

و سیم کی ماں ان کی شادی کے چند ماہ بعد ہی پہاٹائش کا شکار ہو کر چل بسی۔ ماہرہ مزید تنہا ہو گئی۔ و سیم کی بے اتفاقی بدستور تھی۔ کھڑکی میں بیٹھے رہنا اس کا سن پسند مشغلہ تھا۔ وہ چھوٹی موٹی پارٹ ٹائم قسم کی نوکریاں کرتا اور نل ٹائم عشق لڑاتا اور عشق بھی انتہا درجے کا فضول اور بے حاصل بھلا دور سے نظر آتی ایک گوری چنی لڑکی میں کسی کی توجہ آخر کب تک

مبذول رہ سکتی ہے۔ اور اسے نکتے رہنے سے کیا حاصل کیا جاسکتا ہے؟ ماہرہ کو سمجھ نہ آتا۔ لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھی کہ اس بے ضرر فضول اور لا حاصل عشق سے اس کی اپنی زندگی ضرور متاثر ہو رہی تھی۔ وہ موسم بقی کی مانند قطرہ قطرہ پکھل رہی تھی۔ پھر زندگی نے ایک خوشگوار کر دت لی۔ شامک کی اچانک ہی شادی ہو گئی۔ سامنے والی کھڑکی ویران ہو گئی۔ کبھی کبھار شامک کی خرافت ماں وہاں سے جھانکتی دکھائی دیتی پھر اگلے ہی پل کھڑکی بند ہو جاتی تھی۔

و سیم کی نگاہوں کے سامنے سے سورج بنا تو اسے آس پاس جلتے چراغ دکھائی دیے۔ وہ روشنی کا متوالا تھا۔ بہر طور چراغوں کی جانب ہی متوجہ ہو گیا۔ ماہرہ کی زندگی میں تو چپکے سے بہار آ گئی۔ میاں کی ذرا سی توجہ اور محبت پا کر وہ پرانے زخموں کو بالکل بھول بھال گئی۔ اس نے بھی و سیم کو اس کے اس فضول عشق کی بابت یاد نہ دلایا۔ کبھی اسے طعنہ دینے یا چڑانے کی کوشش نہ کی۔ اسے بار بار محسوس ہوتا تھا کہ و سیم اس کے لیول کا انسان نہ تھا۔ ان دونوں کی ذہنی سطح میں بے حد فرق تھا۔ ماہرہ محض تقدیر اور محبت کے سہارے اس فرق کو پانے کی اپنی ہی کوشش کرتی رہی۔ اس سے بہر طور اس قدر تو فرق پڑا تھا کہ ان دونوں کے مابین اجنبیت کی دیوار کی انہیں دھڑا دھڑا کرنے لگیں اور وہاں بننے والے خلاء سے انہیں ایک دوسرے کے خلوص کا چہرہ دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ دونوں کھانا ساتھ کھانے لگے۔ آؤٹنگ پر جانے لگے۔ ایک دوسرے کے سن پسند موضوعات پر بات کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ یہ تو تھا کہ ہر طرح کی کوشش میں ماہرہ کا حصہ و سیم کی نسبت کہیں زیادہ ہوتا تھا پھر بھی اپنی ماسٹرز کی ڈگری کے سہارے وہ ایک ایسے شخص کو اپنا عادی بنانے میں کامیاب ہونے لگی کی زندگی کی شاہراہ پر اس کے لئے ”ان و اعند“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔

اور ابھی وہ پوری طرح اپنے مقاصد میں کامیاب بھی نہ ہو پائی تھی کہ قابو میں آتا ہوا محوڑا پھر رسیاں تڑوا کر بھاگنے کا قصد کرنے لگا۔ سامنے والا جھروکہ پھر آباد ہو گیا۔ وہی رنگین ماحول پھر غزل کہنے لگا اور و سیم نگاہوں میں محبت کے جام بھر بھر کر لٹھہاٹنے لگا۔

ماہرہ کی سنورتی ہوئی دنیا پھر اجڑنے لگی۔ کبھی کبھار اس کا جی چاہتا کہ وہ اپنے گھر سے شامک کے گھر تک کا فاصلہ ایک سانس میں عبور کر لے اور اس سے اعلیٰ سانس میں اسے بے نقط بنا ڈالے۔ اس کا وہ خوبصورت چمکتا چہرہ لبو لبان کر ڈالے۔ اس کی آنکھیں

کر بولی تھی۔

اب کہ بار واقعی شاملہ کا رنگ اڑ گیا۔

”تو پھر؟“ وہ بے ساختگی سے بول پڑی۔

”کل آپ نے ایک کالی قمیض پہنی ہوئی تھی جس پر بہت اچھی کشیدہ کاری تھی..... آپ مجھے ایک نظر وہ قمیض دکھا سکتی ہیں؟ دراصل میں اپنی قمیض پر دیسی ہی کشیدہ کاری کرنا چاہتی ہوں!“

”اُوہ..... ضرور!“ شاملہ مسکرا دی۔

ماہرہ نے محسوس کیا۔ اس کی جان میں جان آگئی تھی۔



”یہ کس کی قمیض ہے؟“ دسم یوں اچھلا تھا جیسے اس کے نیچے کوئی بچہ ہو۔

”سانے والی بلڈمگ میں ایک لڑکی رہتی ہے..... شاملہ.....“ ماہرہ متانت سے بولی ”میں اس سے عاریتا مانگ کر لائی تھی ذرا واپس کر آئیں..... پلیز!“

”مم..... میں..... میں؟ تم پاگل تو نہیں ہو..... میرا مطلب ہے..... میں کیوں جاؤں؟ تم خود واپس کر آؤ!“

”میرے پاؤں میں موج ہے۔ میں اتنی سیر حیاں چڑھ اتر نہیں سکتی۔ یہ آپ کو ہی واپس کر کے آؤ، ہوگی کیا آپ میرے لئے اتنا بھی نہیں کر سکتے؟“

”دسم نے بادل خواستہ قمیض تمام لی۔ اس کا چہرہ کئی رنگ بدل رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ برسوں بعد پہلی مرتبہ محبوبہ کا سامنا کرنے کے خیال سے وہ گھبرا رہا تھا۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ ماہرہ نے یہی محسوس کیا۔ دسم قمیض لے کر فلیٹ سے نکلا تو دونوں ہاتھوں سے سر تمام کر بیٹھ گئی۔“

”ماہرہ شیخ..... فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن.....“

اس کے کانوں میں برسوں پرانے الفاظ گونج رہے تھے۔



جلتی ہوئی موم بیٹوں کو وہ یک تک محسوس رہی تھی۔ موم بیٹوں کی لو کے پس منظر میں

ذہانت کو مانجھتا تھا۔ اپنی قابلیت کا یقین خود اپنے آپ کو دلاتا تھا۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی!

جس وقت وہ شاملہ کے فلیٹ کی گھنٹی کا من دبا رہی تھی اس کے ہاتھ نہ کانپے تھے۔ اس کا حلق خشک نہ ہوا تھا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کی بوندیں نہ تھیں۔

دردنازہ شاملہ نے کھولا اور ماہرہ کو سامنے دیکھ کر یک ثانہ کو سہم گئی۔ پھر فوراً ہی اس نے خود پر قابو پالیا۔

”جی؟“ اس نے انداز میں اجنبیت سمو کر پوچھا تھا جیسے وہ اسے جانتی ہی نہ ہو۔

ماہرہ نے جی ہی جی میں اس کی ذہانت کی داد دی۔

”میں اندر آ سکتی ہوں؟“ وہ نرم روی سے بولی تھی۔

”آئیے!“ شاملہ نے اسے راہ دی۔ لیکن وہ تذبذب کا شکار تھی۔

ماہرہ ایک جذبے کے ساتھ اندر داخل ہوئی شاملہ کھڑکی میں سے جیسی نظر آتی تھی اس کا گھر دیکھا نہ تھا۔ وہ ایک بوسیدہ قسم کا فلیٹ تھا جس میں سالخورہ فرنیچر اور بے مصرف اشیاء بے ترتیب انداز میں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں پڑے ہوئے پلنگ پر شاملہ کی بوزمی ماں لیٹی ہوئی کھانسی رہی تھی۔ البتہ شاملہ بے حد تک سک سے تیار تھی۔ مگر بے جانی رنگ کے لباس میں وہ چمک رہی تھی۔

”تشریف رکھیے!“ شاملہ نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔

ماہرہ نے بیٹھ کر محسوس کیا کہ صوفے کا فوم پرانا ہو چکا تھا اور اسپرنگ باہر کو نکلے ہوئے تھے۔

”کیا خدمت کر سکتی ہوں آپ کی؟“ شاملہ نے پوچھا۔

اس کے چہرے کا رنگ اڑا سا تھا اور حرکات میں اضطراب پوشیدہ تھا۔

”میں سانے والی بلڈمگ کے فلیٹ نمبر 16 میں رہتی ہوں.....“ ماہرہ یوں بولی

جیسے وہ واقعی شاملہ کے پاس کسی ضروری کام سے آئی تھی۔

”جی جی.....“

”مجھے..... کبھی کبھار..... آپ نظر آتی ہیں!“ وہ منہ پر خیر

نظر آتا شاملہ کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ قدرے گھبرائی ہوئی، کچھ شرمائی ہوئی، کنفیوزی لگتی تھی۔
وسیم کپڑے تبدیل کر کے کمرے سے باہر آیا تو اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ان
دونوں کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

ماہرہ نے مسکرا مسکرا کر دونوں کو دیکھا تھا۔ آج وسیم کی سالگرہ تھی۔ ماہرہ نے اسے
سر پرانز دینے کا تہیہ کیا تھا۔ اس نے وسیم کو بتائے بغیر ہی شاملہ کو شام کی چائے پر مدعو کر لیا
تھا۔ پھر اس نے چائے کے ساتھ کتنے ہی لوازمات کا بندوبست بھی کیا تھا۔ بجٹ ایک مرتبہ
پھر اپ سیٹ ہونے لگا تھا۔ لیکن اس نے پروا نہ کی تھی۔ وہ اپنی زندگی کو اپ سیٹ ہونے سے
بچانا چاہتی تھی۔

وسیم اور شاملہ کا یوں موسم بیویوں کی روشنی میں آنا سامنا خاصا سحر انگیز تھا۔ شاملہ
زرد لباس میں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ ماہرہ کو پورا پورا احساس تھا کہ وسیم بار بار
نظر بچا کر اسے دیکھتا تھا۔ وہ دونوں جھینپے جھینپے سے لیکن خوش دکھائی دیتے تھے۔

ماہرہ نے اصرار کر کے وسیم سے ایک کٹوایا اور اسے اس کا تحفہ دیا جو کہ ایک رست
واجب تھی۔ وہ اسے گزرتے ہوئے وقت کے رائگاں جانے کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ بنجانے
وسیم اس کا اشارہ سمجھ بھی پایا تھا یا نہیں۔ شاملہ اس کے لئے شرٹ پیس لائی تھی۔ وسیم شاملہ کا
تحفہ پا کر بے حد خوش ہوا تھا!



پورا ایک سال اس نے جیسے تپتے ہوئے انگاروں پر چل کر گزارا تھا۔ اس کی روح
رنجی ہونے لگی تھی۔ دل سے مدھم مدھم سی آگ بھڑکھڑاتی تھی!

اسے کئی بار خیال آیا تھا شاید اس نے بہت بڑی حماقت کی لیکن ہر مرتبہ وہ سر
جھٹک کر اپنے خیال سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی تھی۔

وہ جو گمن بن کر ایک ناگن کے زہر کا کاٹ کرنے کا چلہ کھینچ رہی تھی۔ اسے اپنے
علم اور اپنی ریاضت پر بھروسہ تھا۔

بال بکھرائے، دھونی رمائے وہ محبت کا منتر پڑھ رہی تھی..... اس طرح کہ نہ تو
خنجر کو پتہ چلے نہ نسل کو..... دوسری طرف ناگن اپنی سحر انگیز آنکھوں میں پراسرار چمک
لئے اپنے شکار کو مسرانا کر رہی تھی۔ بنجانے کس وقت وہ پھیلا ہوا پھن لے کر شکار پر بھیٹ

پڑتی، کچھ اندازہ نہ تھا۔

ناگن چوکس تھی اور جو گمن مطمئن!



وسیم نے بنوے میں سے رقم نکال کر گھنی پھر جھنجھلا کر بنوڈ میز پر پھینک دیا۔
"کیا مصیبت ہے!" وہ جھنجھلا رہا تھا۔

ماہرہ نے نکلیوں سے اسے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی ان دونوں کے بیچ محبت کا
کلائنگس چل رہا تھا۔ شاملہ کی نت نئی فرمائشیں وسیم کے لئے عذاب جاں بحق جاری تھیں۔ وہ
ایک کنگے عاشق کی دوسری بیوی بننے پر خود کو آمادہ نہ کر سکتی تھی اور اب کسی بھی طرح اس عشق
فصول کا دھول اپنی گردن سے اتار بھیجنے کا چاہتی تھی۔ سواب وہ ہر دوسرے دن وسیم سے کوئی
مہنگی سی فرمائش کیا کرتی تھی۔ وسیم کھڑکی تک گیا۔ دوسری جانب کھڑی شاملہ نے اس سے
اشارے میں کچھ پوچھا تھا۔ وسیم نے قدرے غصے سے سرٹنی میں بلایا۔ دوسری جانب کھٹاک
سے کھڑکی بند کر دی گئی۔ وسیم نے اپنی کھڑکی اس سے بھی زیادہ زوردار آواز میں بند کی اور
زیر لب ایک موٹی سی گالی بھی دی۔

ماہرہ نے پرسکون سانس لیا۔ وہ جانتی تھی اب یہ کھڑکیاں کبھی نہ کھلنے کے لئے بند
ہوئی تھیں۔ جو گمن نے زہر نکال کر اسے تروپنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ ریاضتوں کا سفر کامیابی
سے طے ہوا تھا۔ وسیم کی جولانی طبع کو کسی نئے عشق پر آمادہ ہونے کے لئے اب ایک طویل
عرصے کی ضرورت تھی۔

دونوں کھڑکیوں کے مابین کچھ نہ تھا سوائے Fantasy کے اور Fantasy
ختم ہو جائے تو دلچسپی باقی نہیں رہتی۔

ماہرہ ایک عزم کے ساتھ تھکے ہارے، منسخت، شکست خوردہ اور شرمندگی کے بوجھ
تले دبے ہوئے وسیم کے لئے چائے بنانے کے لئے انھی۔

"ماہرہ شیخ فرسٹ کلاس فرسٹ پوزیشن ماسٹر ان ایپلائڈ
سائیکولوجی....." اس کے کانوں میں الفاظ گونجے۔ اس کے ذہن میں اپنی ڈگری کا ٹکس
چمک رہا تھا!



پرکٹی

اطہر نے چپکے سے نگاہیں اٹھائیں اور کتاب کے پیچھے چہرہ چھپا کر است دیکھا۔ وہاں موسلا دھار برسات ہو رہی تھی۔ موسم بے حد خطرناک ہو چکا تھا۔ اطہر نے جلدی سے کتاب اوپر کر لی اور ناول پڑھنے میں بری طرح منہمک ہو گیا۔

ماریہ اب سونے کی تیاری کر رہی تھی۔ چیزوں کی اٹھانچ جاری تھی۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ اطہر کو الجھن ہونے لگی۔ اس نے پھر ذرا کی ذرا کتاب سر کا است دیکھا۔ وہ نٹو پیر سے آنکھوں کو خوب خوب رگڑ رہی تھی۔ پھر وہ میسر برش اٹھا کر بالوں میں چاٹنے لگی۔ انداز میں کسی ہجرے ہوئے دریا کا سازور و شور تھا۔ اطہر پھر کتاب کے پیچھے دبک گیا۔

چند ٹائیوں کے بعد وہ دھڑام سے اپنی جگہ آ کر گرئی۔ تکیہ سر کے نیچے سے نکال کر چہرے پر رکھا اور بے حس و حرکت ہو گئی۔

اطہر کا جی چاہا کتاب بند کر کے دور پھینکے اور اس کا تکیہ اٹھا کر کتاب پر دے مارے پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تمام کر جھنجھوڑ کر اپنا قصور پوچھے! بھلا اس سارے قصبے میں اس کی جان تا تو اس کا کیا قصور تھا؟

آج کا دن جو کہ گزر رہی چکا تھا ان کی شادی کی سالگرہ کا دن تھا۔ ماریہ چونکہ بے حد رومینگ مزاج کی حامل لڑکی تھی سو اپنے مزاج کی مناسبت سے اس نے اپنی شادی کی سالگرہ کے لئے خوب خوب پروگرام ترتیب دیئے تھے۔ آخر یہ ان کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی وہ اس دن اپنے عروسی جوتے میں ملیں ہو کر سالگرہ کا کیک کاٹنا چاہتی تھی۔ پھر وہ آؤٹنگ کے لئے باہر جانا چاہتی تھی۔ ”کوہ پر کیٹل“ میں ایک عالی شان قسم کے ڈنر کے بعد

اس کا ارادہ ساحل سمندر پر جانے کا تھا۔ سوئے اتفاق آج کی رات چاندنی رات بھی تھی ماریہ بہت جوش و خروش کے ساتھ کوئی ہفتہ بھر سے یہ سب پروگرام ترتیب دے رہی تھی۔ اطہر نے بڑے پیمانے پر دعوت اربخ کرنا چاہی تو ماریہ نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کے خیال میں یہ دن قطعی طور پر صرف ان دونوں کا دن تھا اور کسی تیسرے فرد کی مداخلت اسے منظور نہ تھی۔ کجایہ کہ دعوت کے نام پر کئی لوموں کو اکٹھا کیا جاتا۔ اطہر نے بھی اس کی خوشی کے خیال سے اپنے آئیڈیا کیمنسل کر دیا تھا۔ آفس سے بھی وہ بہت جلد لوٹ آیا تھا۔ لیکن آج کا دن شاید قسمت کی خرابی کا دن تھا۔ گھر لوٹ کر اسے علم ہوا کہ اس کی دونوں بہنیں اپنے اپنے کنبے کے ہمراہ گھر میں موجود تھیں۔ عارفہ اور شارقہ کی یادداشت بلا کی تیز تھی اور ایسے مواقع وہ خاص طور پر ذہن نشین کر لیا کرتی تھیں۔ وہ دونوں بنا کسی تجھے کے اپنے اپنے بچے لے کر آگئی تھیں اور اپنی ماں سے خاص طور پر گھر کی چکی ہوئی برائی اور کھیر کی فرمائش کی تھی۔ مباحثہ بیگم نے بیٹیوں کی فرمائش پر فی الفور ماریہ کو برائی اور کھیر تیار کرنے کا حکم صادر کر دیا تھا۔

اطہر جس وقت گھر لوٹا ماریہ اسے عروسی لباس میں ملبوس منے کے بجائے ایچرن باندھے پیاز کا تکی ہوئی نظر آئی۔ اس کی آنکھوں سے دھواں دھار پانی بہہ رہا تھا۔ جو پیاز کے اثرات کے بجائے اس کے اندرونی جذبات کا مظہر تھا۔ اطہر نے اس سے بات کرنی چاہی تو وہ رخ موز کر کھڑی ہو گئی۔ وہ چپ چاپ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ پھر اس کی بہنیں ’بھائی‘ ’بھائی‘ اور ’بچے‘ ’ماموں‘ ’ماموں‘ کرتے کمرے میں آن گھسے تو اس کا دھیان ماریہ کی جانب سے بہت سا گیا۔ وہ بہنوں کی خوش گپیوں اور بھانجے بھانجیوں کی شرارتوں میں محو ہو گیا۔

رات گئے اس کے بہنوئی اپنی بیویوں کو لینے آئے۔ ماریہ کو پھر سے کھانا گرم کر کے انہیں بھی سرد کرنا پڑا بظاہر وہ خاموش اور پرسکون تھی لیکن اطہر جانتا تھا کہ اس خاموشی کے پیچھے کتنے طوفان پوشیدہ ہیں۔ مہمانوں کے جانے کے بعد جب گھر میں سناں چھا گیا اور امی ابوسونے کے لئے اپنے کمرے میں چلے گئے تو وہ کسی ہجری ہوئی شیرنی کی طرح کمرے میں اٹھانچ کرنے لگی تھی اور اب تھک ہار کر سونے کے لئے لیٹ گئی تھی۔ اطہر کا جی چاہتا تھا

وہ اسے منائے لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایک مرتبہ رونا شروع کر دے گی تو ساری رات اس کے آنسو پونچھتے ہی گزرے گی۔ پھر یہ مسئلہ کوئی نیا تو نہ تھا اور نہ ہی حل ہو سکتا تھا۔ وہ وہ بہنوں کا اکٹوتا بھائی تھا۔ ماں باپ کا اکٹوتا بیٹا! پھر اس کی بہنیں عمر میں اس سے کافی بڑی تھیں۔ کسی بھی معاملے میں ماں بہنوں کے سامنے جرأت لب کشائی اسے نہ تھی۔ عارفہ اور شارقہ اپنے اپنے گھروں میں قطعاً آزاد اور خود مختار تھیں۔ شوہران سے دبتے تھے۔ ان پر قدغن لگانے یا روک ٹوک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ دونوں ہر دوسرے روز اپنے بچے لے کر نیکے میں آن دھمکتی تھیں۔ ماں باپ اپنی بیٹیوں کے دیوانے تھے۔ وہ ان پر داری بنار ہوئے۔ ان کے بچوں کے آگے پیچھے پھرتے۔ ماریہ کو ان کی خاطر مدارت میں اپنا پورا دل کچن کی نظر کرتا پڑتا تھا۔

شروع شروع میں اسے بھی مزہ آیا۔ مندوں کے آجانے سے گھر میں رونقی ہو جایا کرتی تھی۔ ان کے بچوں کی معصومانہ باتوں میں بے حد اچھا وقت گزرتا تھا۔ اطہر اور وہ خوب خوب سنا کرتے تھے۔ اکثر پٹنگ کا پردہ رام بنا کرتا۔ سب مل کر پٹنگ پر جاتے۔ خوب بلا گھا ہوتا۔ کبھی گھر پر ہی محفل جمتی۔ باہر سے کھانا منگوا لیا جاتا۔ وہ سب مل کر تاش کھیلتے۔ کوئی نئی فلم دیکھی جاتی۔ تبہرے ہوتے۔

رفتہ رفتہ ماریہ کا جی ان باتوں سے ادبے لگا۔ اس پر انکشاف کے دروا ہونے لگے۔ اطہر مٹی نیشیں کپینی میں ابھی پوسٹ پر فائز تھا اور پرکشش تنخواہ پاتا تھا۔ لیکن بہنوں کے ہر دوسرے روز وارد ہونے اور دعوئیں اڑانے کے عمل سے تنخواہ میں سے کچھ بھی پس انداز نہ ہو پاتا۔ مہینے کے ختم ہونے سے پہلے ہی تنخواہ ختم ہو جاتی۔ اطہر کو ادھار لینے کی نوبت بھی اکثر آ جایا کرتی۔ پھر ماریہ کی مصروفیت بے پناہ رہتی۔ طرح طرح کے پکوان بنا کر وہ عاجز ہو جاتی تھی۔ پھر بھی بچے نت نئی فرمائشیں کیا کرتے۔ عارفہ اور شارقہ "مامی سے کہو" کا لاڈ بھرا جملہ بول کر بے گمری سے ماں سے باتوں میں مشغول رہتیں۔ ماریہ کے ارد گرد بچے تاجا کرتے اور شور مچا کر مختلف فرمائشیں کرتے۔ ان کے جانے کے بعد بھی ان کی بکھیری ہوئی چیزیں سینے سینے اسے آدمی رات ہو جاتی تھی۔ تب کہیں تھک بار کر اسے بستر نصیب ہوتا تھا۔ چند ایک دن سکون رہتا اور پھر ایکشن رے لپے ہو جاتا تھا۔ ماریہ آرتھک مزاج کی لڑکی تھی۔ اسے گھر کو سجانے سداور نے کا شوق تھا۔ جگہ جگہ رکھے ہوئے ڈیکوریشن ہیں اسے

بھاتے تھے۔ لیکن عارفہ کے پانچ اور شارقہ کے تین بچوں نے اس کے شوق کا حلیہ بکاڑ دیا تھا۔ ماریہ کی شوق سے بنائی ہوئی چیزیں کچھ ہی عرصے میں کوزے دان کی زینت بن جایا کرتی تھیں۔ رفتہ رفتہ اس نے اس شوق سے بھی ہاتھ اٹھا لیا۔ گھر کی دیواروں پر بچوں نے خوب خوب گل و گلزار کھلائے تھے۔ ان لوگوں کا بندر دم بھی اس کی دسترس سے محفوظ نہ رہ سکا تھا۔ ماریہ کے جہیز میں آئے ہوئے فرنیچر کی خوب ریوڑ لگی تھی۔ سائڈ میبلوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ درازوں کے بونڈ کھل گئے تھے۔ صوفوں کا کپڑا کسی ستم ظریف نے چھری مار کر پھاڑ دیا تھا۔ ماریہ بے حد حسرت سے اپنے جہیز کی بیش قیمت چیزوں کا حشر دیکھا کرتی تھی۔

اطہر جانتا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی تھی۔ لیکن وہ خود کو مجبور محسوس پاتا تھا۔ آخر وہ اپنی بڑی بہنوں کو مہر آنے سے روک تو نہ سکتا تھا۔ ان کے بچوں کے ہاتھ پیر وہ نہیں باندھ سکتا تھا نہ ہی انہیں تیز سکھانا اس کے اختیار میں تھا۔ ماں باپ کے سامنے زبان کھولنے کا بھی وہ تصور تک نہ کر سکتا تھا۔ کجایہ کہ وہ ان سے الگ ہونے کے متعلق سوچتا!

پس اتنا طے تھا کہ اس کے بس میں کچھ بھی نہ تھا جو وہ ماریہ کے لئے کر پاتا۔ بھلا وہ اس کے حق میں بولتا بھی تو کیا بولتا؟ ماریہ اندر ہی اندر گھل رہی تھی۔ ازدواجی زندگی میں مندوں کی بے جا مداخلت نے اس کی نیندیں حرام کر دی تھیں۔ وہ خوشی سے دور ہوتی جابری تھی۔ وہ اپنے طور پر جینے کی خواہش مند تھی۔ اسے پرسکون گھر کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن عارفہ اور شارقہ سب کچھ جانتے بوجھتے بھی اپنی روش سے دستبردار ہونے پر قطعاً آمادہ نہ تھیں۔ وہ سمجھتی تھیں کہ گھر کی ہر چیز میں ان کا حصہ ہے اور وہ دھڑلے سے اپنا حق وصول کرتی تھیں۔ غالباً انہوں نے اپنا حق ماریہ کی خوشیوں میں بھی شامل کر لیا تھا۔



ماریہ کے مزاج میں تبدیلی آ رہی تھی۔ وہ دن بدن ذہنی طور پر اطہر سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ یوں تو وہ ایک نرم مزاج اور اچھے دل کی لڑکی تھی لیکن حالات اسے بد مزاج بننے پر مجبور کر رہے تھے۔ وہ چیز چڑی ہوئی جا رہی تھی۔ اطہر کو اپنی پرواہ نہ تھی لیکن اسے اپنی بہنوں اور اپنے ماں باپ کے جذبات کا خیال تھا اسے یہ فکر دامن گیر تھی کہ کہیں ماریہ ان لوگوں سے برے طریقے سے پیش نہ آئے۔ وہ ماریہ کو سمجھاتا چاہتا تو اس کا رد عمل بے حد خراب ہوتا تھا۔

وہ اسے برا بھلا کہتی۔ دو دو دن بات نہ کرتی۔ منہ پھلائے پھرا کرتی۔ ہر چند کہ اب تک اس نے اپنے سانس سر یا نندوں سے براہ راست ایسی کوئی بات نہ کہی تھی لیکن اس کا گریز آمیز رویہ بزبان خود اپنی کہانی کہنے لگا تھا۔ اطہر کی ماں کی پیشانی شکن آلود رہنے لگی تھی۔ انہیں بیٹیوں سے بے حد محبت تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ ہر مرتبہ ان کی آمد پر انہیں شایان شان پروٹوکول پیش کیا جائے۔ اطہر مشکل میں تھا۔ وہ نہ اپنے گھر والوں سے کچھ کہہ سکتا تھا اور نہ ماریہ سے روز روز کی معذرتیں اسے مناسب لگتی تھیں۔ وہ نہ گھر والوں کو تصور دار سمجھتا تھا اور ماں بہنوں کی محبت سے بھی بندھا ہوا تھا۔ بس اسے توازن قائم کرنے میں دشواری کا سامنا تھا۔ ماریہ کی جانب سے قبل جنگ روز روز مزید پردھک ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر ایک پر غزم کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ ایک خاص اور منطقی نتیجے کی سمت بڑھ رہی تھی۔ اطہر اس کی خاموش پیش قدمی محسوس کر کے خوفزدہ ہو گیا۔ وہ اپنا گھر برباد ہونے سے بچانا چاہتا تھا!



ماریہ نہانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ واڈ روپ کے سامنے کھڑی نظروں ہی نظروں میں لباس کا انتخاب کر رہی تھی۔ اطہر خاموشی سے اس کی پشت پر جا کھڑا ہوا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر لال رنگ کا لباس کھینچ کر نکالا۔

”یہ پہنو!“ اس نے نگاہوں میں محبت کے سات رنگ بھر کر اسے دیکھا۔ ”سرخ رنگ محبت کی علامت!“ ماریہ کی خفا رہنے والی نگاہوں میں حیرت اندی۔ اطہر جیسا لئے دیئے رہنے والا انسان اسے محبت کی علامت کا رنگ پہننے کے لئے اسرار کر رہا تھا۔ اور محبت؟ ان دونوں کے بیچ بھلا محبت تھی کہاں؟ ”نہیں!“ وہ آہستگی سے بولی۔ ”یہ پہننے کو جی نہیں کرتا۔ گری بہت ہے۔ کوئی لائٹ سا کالر۔“

”اوں ہوں“ اطہر نے مان سے اسے لباس تنہا کیا۔ ”لال رنگ میں تم بے حد دلکش نظر آتی ہو۔ تمہیں یہی پہننا ہوگا۔ میری خاطر!“

ماریہ جزبہ ہوئی۔ پھر خاموشی سے کپڑے لے کر دامنِ روم کی سمت بڑھ گئی۔ اطہر کے لبوں کے گوشے مسکراتے گئے۔ ہر زبانت میں کج بخشی کی عادی ماریہ نے بے حد آرام سے اس کا کب مان لیا تھا۔



”اس قدر لاجواب چائے بس تم ہی بنا سکتی ہو!“ اطہر نے پیالی تھامنے کے بجائے ماریہ کا ہاتھ ہی تھام لیا تھا۔ ماریہ جھینپ کر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

”پی کر تو دیکھیں پہلے!“ وہ نظریں جھکائے جھکائے بولی۔

”پی کر کہا تو کیا کہا!“ اطہر مسکرایا۔ ”اس چائے کی پیالی میں جو محبت ہے اس کا

نثر بنا پیے ہی مجسوس کیا جاسکتا ہے۔“

اس نے محبت سے اس کے چہرے پر جموتی لٹ اس کے کان کے پیچھے کی۔ ماریہ

کا چہرہ اندرونی خوشی کے احساس سے سرخ ہو رہا تھا۔

”اطہر آپ..... ایسے کیوں نہیں تھے پہلے۔“ اس نے ماتھا اس

کے کاندھے سے ٹکا کر کہا۔

”بس تو ایسا ہی ہوں ماریہ..... تم نے کبھی سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔“ وہ

محبت سے اس کے بالوں میں اٹھکیاں پھیرنے لگا۔ ”مجھے تمہاری بے مہر نگاہوں سے شکایت ہے انہیں میری نظروں کی زبان سمجھ نہیں آتی۔“

ماریہ نے چہرہ اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”صرف نظروں میں کام نہیں چلے گا۔“ وہ مسکرائی۔ ”زبان بھی استعمال کرنا ہو

گی۔ آپ کے لبوں سے ایسی باتیں بہت اچھی لگتی ہیں۔“

”جو قسم سرکار کا۔“ وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

ماریہ مسکرا دی تھی!



”ماریہ جان، کل شارقہ باجی آ رہی ہیں۔ ان کے بچوں کی اسکول کی چھٹیاں

ہیں۔ وہ ہفتہ بھر ہمارے ساتھ رہیں گی۔“

ماریہ کا چہرہ لمحہ بھر کے لئے بچہ سام گیا۔ اطہر نے اس کے بالوں میں اٹھکیاں پھیریں۔

”وہ جو بیٹھا تم نے اس روز بنایا تھا کس قدر لاجواب تھا۔“

اٹھکیاں جانتا رہ گیا۔ دینی ناؤ نہ کل سچ عید کا مزد آ جائے گا۔“

”اچھا۔“ ماریہ مسکرائی۔ ”آپ کو پسند آیا۔“

”ارے زبردست! تمہارے ہاتھ میں جو ذائقہ ہے ایسا ذائقہ تو امی جان کے ہاتھ میں نہیں ہے۔ کہتے ہیں بیٹے اپنی ماں کے ہاتھ کا پکا نہیں بھولتے۔ تم نے تو مجھے سب کچھ بھلا کر اپنا اسیر کر لیا ہے۔“

ماریہ کا چہرہ گل و گلزار ہو گیا۔

”پھر کل کیا کیا کھلا رہی ہو؟“ اطہر نے لاڈ سے پوچھا۔

”جو آپ کہیں.....“ وہ مسکرائی۔

”یعنی جناب کا مینو ہمیں ترتیب دینا ہو گا؟ بھئی وا..... نند آپ کی

آئے..... ذہن پر زور ہم ڈالیں..... کہاں کا انصاف ہے..... خیر خیر میں

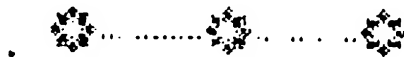
سوچ کر بتاتا ہوں۔ تب تک ایک پیالی چائے ہو جائے؟“

”ابھی لائی.....“ ماریہ لچکتی ہوئی کمرے سے نکلتی تھی۔

اطہر نے سکون کا سانس لیا۔ اس کی نگاہ اپنی انگلیوں پر گئی۔ ان کے درمیان ماریہ

کا لانا، سنہرا بال پہنسا ہوا تھا۔ اطہر نے ہاتھ اپنے چہرے کے قریب کر کے اس بال کو غور

سے دیکھا پھر وہ مسکرا دیا۔!



تم بھی تو یہی کرتے

میں نے شدت سے دیکھتے ہوئے پوٹوں کو ملا اور بمشکل آنکھیں کھول کر اپنے سامنے والی سیٹ پر بیٹھی اس نازنین کو دیکھا۔

اس نے آسانی رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے تھے آسانی رنگ کا باریک دوپٹا اس کے سیاہ بالوں کے لشکارے چھپانے سے قاصر تھا۔ ایک لائبریری لٹ اس کے گال سے بار بار ٹکرا رہی تھی۔ جسے وہ شہادت کی انگلی سے کان کے پیچھے کرتی اور لٹ پھر مسکرا کر سر نکال لیتی تھی۔ لٹ کی شرارت بھری مسکان سے قطع نظر اس کا اپنا چہرہ قطعاً سنجیدہ تھا اور لب ہلکی سی سختی سے بچنے ہوئے تھے۔ پھر میں نے سامنے میز پر پڑے ہوئے اس کاغذ کو دیکھا یہ غلی کا خط تھا۔ سفارش نامہ جو وہ نازنین اپنے پرس میں اس امید پر رکھ کر لائی تھی کہ میں اسے پڑھتے ہی اسے نوکری دے دوں گا۔ اس کی امید کچھ ایسی غلط بھی نہ تھی۔ غلی میرا بہترین دوست تھا۔ ہم ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ اور میں اس کی سفارش برعز رد نہ کر سکتا تھا۔ اول تو وہ بے جا سفارش کا قائل نہ تھا دوسرے وہ انتہائی مجبوری کی حالت میں کوئی ایسا قدم اٹھاتا تھا۔

خط کے الفاظ پر سے میری نظریں پھسلتی ہوئی اس کی آپس میں الجھی ہوئی انگلیوں میں جا ٹکیں۔ میز پر دترے ان ہاتھوں میں ایک جب ارتعاش سا تھا۔ شاید وہ نروس ہو رہی تھی۔ جب کوئی میرے سامنے بیٹھ کر نروس ہونے لگے تو مجھے لطف محسوس ہوتا ہے۔ شاید اس لئے کہ ایک زمانے میں میں بھی بڑا نروس شخص تھا۔ جب میں کسی نوکری کے لئے ہونے والے انٹرویو کے لئے کسی بورڈ کے ممبران کے سامنے جا کر بیٹھتا تو میرا ماتھا نم ہو جایا کرتا تھا اور کانپتی انگلیوں کو آپس میں سختی سے الجھا کر میں ہمیشہ اپنی گود میں رکھ لیا کرتا تھا اور

سب سے پہلے ایک گلاس پانی مانگا کرتا تھا۔

”سرا ایک گلاس پانی مل سکتا ہے؟“ میرے کانوں سے اس کی آواز نکلائی۔

میں نے اس کے روشن چہرے پر ایک نگاہ ڈالی اور گھٹنی بجا کر چڑا سی سے پانی لانے کے لئے کہا۔

”کیا نام بتا آپ نے؟“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔

ہر چند کہ اس کی فائل میرے سامنے پڑی تھی۔ جس پر مولے مولے حروف میں ربیعہ انصاری لکھا تھا۔ اور کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ مجھے دوسرے اپنا نام بتا چکی تھی۔ جو مجھے یاد بھی تھا۔

”جی۔۔۔ ربیعہ۔۔۔ ربیعہ انصاری۔“

اس نے پانی کا گلاس جلدی سے لبوں سے بنا کر جواب دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بہت سا پانی اس کے کپڑوں پر چھلک گیا۔ گلاس میز پر رکھ کر وہ شرمندگی سے اپنے کپڑے جھانسنے لگی۔ نشوونما کا ذہبہ میں نے خاموشی سے آگے کر دیا۔

اس کی آنکھیں ہناتی تھیں کہ وہ بڑی شرمیلی طبیعت رکھتی ہے اور ناک کی بناوٹ سے اس کے انتہائی خود دار اور کم آئیز ہونے کا پتہ چلتا تھا۔ ہونٹوں کے کنارے سے غم ہوتا تھا کہ وہ اتنی کم عمر نہیں ہے لیکن محتاط ہے۔

اس کی ناک سے پتہ چلتا تھا کہ وہ اپنے اندر خاصی قابلیت رکھتی ہے اور کوئی مٹی گزری لڑکی نہیں لہذا اس کی گھبراہٹ کی وجہ غالباً یہ ہو سکتی تھی کہ وہ ایک عمد سفارشی خط لے کر میرے پاس آئی تھی۔ اور اس بات پر مجھ سے اور خود سے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔

”میں ربیعہ انصاری“ میں نے خط اپنی دراز میں ڈال لیا۔ ”آپ کل سے آ سکتی ہیں۔ میں آپ کو اپنا ٹکٹ لیئرناپ کر دے دیتا ہوں۔ ہانچنگ اور شارٹ ہینڈ آپ کو آتی ہے۔ ڈیکٹیشن بھی آپ اچھی ہی کر لیں گی۔ آپ کا تعلیمی ریکارڈ اچھا ہے۔ آپ کی میزبانی میرے کمرے میں ہوگی۔“

”اوو!“ نجانے کب کا عقیدہ سانس اس کے سینے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے لب کو دو انتوں سے دب کر مسکراہٹ کو روکا اور تین بنے رہنے کی کوشش

جاری رکھی۔

”نی الحال آپ کی تنخواہ چھ ہزار روپے ماہوار ہے بعد میں اس میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور ہوتا رہے گا۔“

”جینک یوسر! جینک یو دیری بچ۔“ اس کی آنکھیں سچ سچ نمبر آئیں۔

”کانچ کی گڑیا“ میرے ذہن نے فوراً اس منظر پر کمپنیشن لگایا۔

نجانے کیا بات ہے ہر منظر ہر سچویشن پر میرا ذہن کوئی نہ کوئی عنوان ضرور دنت کرتا ہے اس کے بعد میں نے اپنا سر کرسی کی پشت پر نکا کر آنکھیں بند لیں۔ جلتی ہوئی آنکھیں بند کرنے سے کیسی رقت آمیز تکلیف ہوتی ہے۔ گزشتہ رات جاگتے ہوئے میری آنکھیں اب ایل بھسوکا ہوتی تھیں۔ جسم کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔

”میں تم سے بیزار ہو چکا ہوں۔ تمہاری صورت سے نفرت ہو چکی ہے مجھے۔ تم پر نگاہ پڑتے ہی میرا اچھا بھلا موز بھی غارت ہو جاتا ہے۔ آئی ہیٹ یو آئی ہیٹ یو۔“

یہ میرے آخری الفاظ تھے جو میں نے رات کو خبرین سے کہے تھے۔ اس کے بعد وہ ڈائٹنگ روم میں جا کر الماری سے کانچ کے برتن نکال نکال کر تونز نے میں مصروف ہو گئی تھی۔ لڑائی سے فارغ ہونے کے بعد ذہن کو فریش کرنے کے لئے یہ اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ تین چار ڈنر سیٹ دو تین لی سیٹ وغیرہ توڑ کر اس روہانی مشق کا انتقام ہوتا تھا۔ اور پھر وہ اپنے کمرے کا دروازہ زور دار آواز کے ساتھ بند کر کے سو جاتی تھی۔ اور میرے دماغ میں بقیہ ساری رات برتنوں کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔

چھین چھین چھیناں چھیناں۔“

میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں۔

نجانہ میرے مقابل کھڑی تھی۔ نجانے اسے کیسے علم ہو جاتا تھا کہ میں خبرین سے کب لڑتا ہوں۔ دوسرے دن میرا بڑا خیال رکھتی تھی۔

”بس نجانہ۔ پلیز۔“

دو کپ چائے بنا کر لے آئی اور اپنا کپ لے کر میرے مقابل بیٹھ گئی۔

اس کی مخصوص عادت تھی۔ میں جب بھی چائے پیا کرتا وہ دو کپ چائے پاتی اور

جاتے ہیں اس کی۔

”یا خدا!“ میں اپنا سر تھام لیتا۔ آخر میں بھی انسان تھا۔ مرد تھا۔ جوان تھا۔ بھولے بھٹکے دانستہ یا نادانستہ نگاہ کسی سمت اٹھ ہی جاتی تھی۔ نگاہوں کے پرتو نہیں ہوتے جنہیں میں کاٹ ڈالتا۔ پیر بھی نہیں ہوتے جنہیں زنجیریں ڈال دیتا۔

وہ مجھے جتنا احساسِ دہلائی اتنا ہی میری نظریں دوسری جانب اٹھا کرتیں۔ اس کھینچا تانی کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے محفلوں، دعوتوں میں جانا انتہائی کم کر دیا۔ وہ مجھ سے کہیں چلنے کا کہتی، میں صاف انکار کر دیتا۔ وہ شاپنگ کے لئے ضد کرتی میں جان بوجھ کر دیر سے گھر جاتا۔ وہ فلم پر چلنے کے لئے اصرار کرتی میں اسے مشورہ دیتا، اپنی کسی سیٹیلی کے ساتھ چلی جاؤ، اسکرین پر بہروں آئے گی، خواہ مخواہ میری آنکھیں سکھیں گی۔

ہمارے درمیان خلیج بڑھتی چلی گئی۔ زندگی کی رسی کو تھام کر چلنے کے بجائے ہم دونوں دو انتہائی سردیوں پر چلے گئے اور روزِ مرد کی لڑائیاں ہمارا معمول بن گئیں۔ اس پتے ریگزار میں نیچے پاؤں چلتے ہوئے بارش کا جو پہلا قطرہ میرے لبوں سے نکلایا اس کا نام ربیعہ انصاری تھا۔



آسانی، ریم، میرا فیورٹ تھا۔ شاید اس کا بھی تھا۔ وہ عموماً آسانی، رنگ کا لباس زیب تن کرتی تھی۔ اس رنگ میں اس کی رنگت چمکنے لگتی تھی اور اس کی بادامی آنکھوں میں نیلے سمندروں کا عکس آ جاتا تھا۔ آسانی دوپٹے کے نیچے سے اس کے بال اپنے گہرے سیاہ ہونے کا بھرپور احساس دلاتے تھے اور اس کی آنکھوں میں کاجل کی جوت نمایاں ہو جاتی تھی۔ ناک کی اوچک مزید لشکارے مارتی تھی اور لبوں کی گلابیاں واضح ہو جاتی تھیں۔ لیکن شاید یہ سب آئینہ میرا دہم تھا۔ وہ تو مجھے ہر رنگ میں اچھی لگتی تھی۔

اس دن وہ نو بجے تک نہیں آئی۔ میں ٹھیک پونے نو بجے آفس پہنچ جاتا تھا تاکہ دیکھ سکوں کہ کون کتنا وقت کا پابند ہے۔

ربیعہ انصاری مجھے ہمیشہ اپنی سیٹ پر ملتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ احتراماً کھڑی ہوتی اور رسماً مسکراتی تھی۔

اپنا کپ لے کر سامنے بیٹھ کر پیا کرتی تھی۔ اپنی ملازمت کے دن سے اس لڑکی نے میرے قریب آنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن غبرین میری زندگی میں آنے والی پہلی اور اب تک آخری لڑکی تھی۔ دراصل میری زندگی میں آنے کے بعد اس نے مجھے لفظ ”عورت“ سے چڑ دلا دی تھی کہ دوسری کسی عورت کے آنے کا کوئی راستہ چھوڑا ہی نہ تھا۔ اور پر لطف بات یہ تھی کہ میری اور اس کی ہر لڑائی کی بنیادی وجہ اس کا وہ شک تھا جو وہ مجھ پر کسی دوسری عورت کے مجھ سے دس فٹ کے فاصلے سے گزر جانے پر بھی کیا کرتی تھی۔ اس کے اس شک نے میری زندگی کا نمونہ کی تیج بنا دی تھی۔ مجھ زندگی اور عورت دونوں سے نفرت ہو چکی تھی۔ ایسے میں بھلا کسی نعمانہ یا نعمانہ کی کیا چلنی تھی؟

غبرین سے میری شادی کسی انصیر کا نتیجہ نہ تھی۔ مجھ سے پہلے یہ برنس اس کے والد سنبھالا کرتے تھے اور میں۔ اس آفس میں ایک معمولی کمزور کے طور پر بھرتی ہوا تھا۔ بعد ازاں میری صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے ترقی پر ترقی دیتے گئے۔ اور پھر ایک دن ان نوازشات کا پول بھی کھل گیا۔ جب انہوں نے مجھے اپنا سارا برنس سنبھال لینے کی آفر کی لیکن اس شرط پر کہ میں ان کی اکلوتی بیٹی سے شادی کر لوں۔

میں نہیں جانتا، غبرین میں کیا کئی یا کون سی خامی تھی جو انہیں از خود اپنی بیٹی کے لئے کسی شخص سے کہنا پڑا۔ وہ قبولِ صورت پر دم کی لکھی لڑکی تھی۔ البتہ مزاج کی از حد تیز تھی۔ بعد میں اس کے مزاج کی یہ تیزی اور جھنجھکی میری پوری زندگی میں کھل گئی۔

وہ سمجھتی تھی کہ مجھ سے شادی کر کے اس نے مجھ پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ اتنا بڑا برنس محض اس کی وجہ سے مل گیا ورنہ میں تو ساری عمر فٹ پاتھوں پر جوتیاں چٹختا رہتا۔ اسے وہم رہتا تھا کہ میں دوسری عورتوں سے جان بوجھ کر فرنی ہونے کی کوشش کرتا ہوں۔ دھوتوں میں وہ مجھے بار بار شہو کے دے کر اپنی جانب متوجہ کئے رہتی اور واپسی میں پوچھتی۔

”یہ تم بنا وجہ مسز عثمانی کے گلے کا بار کیوں بنے جا رہے تھے؟“

کیا میں دیکھ نہیں سکتی کہ تمہاری نگاہیں کہاں ہوتی ہیں؟ تم خالیہ احمد کی بلائیں

نگاہوں ہی نگاہوں میں لے رہے تھے۔ بس چلتا تو اسے اپنے ساتھ اٹھا لاتے۔

تو یہ میں سے اس قدر جھجک کر بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ گود میں بیٹھ

لیکن آج وہ اپنی سیٹ پر موجود نہ تھی۔ میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔
کیا آج وہ نہیں آئے گی؟ اس نے چھٹی کر لی ہے؟ لیکن اس کا فرض تھا کہ
مجھے پہلے سے مطلع کرتی؟

میں نے اپنی کرسی پر بیٹھ کر نعمانہ کی سیٹ کی ہوئی ٹانگیں اپنے آگے کھسکائیں اور
رست و اراج پر گناہ دوڑائی۔ اس کے نہ آنے کے تصور سے میں نجانے کیوں پریشان ہو رہا
تھا۔ شاید وہ میرے لئے سکون آور دوائی کی شیشی تھی جسے محض اپنے سامنے رکھا دیکھ کر مطمئن
رہتا تھا۔ خبرین کی کڑوی کسلی باتوں کے بعد اس کا نظارہ وہ شیشی گولی تھا جسے میں نظروں کے
ذریعے اپنی زبان پر رکھتا اور دھیرے سے نگل کر ہر غم سے آزاد ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی خالی
سیٹ سے مجھے وحشت ہونے لگی۔

سوانویجے وہ ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی۔

”اوہ“ مجھے اپنی جگہ دیکھ کر وہ وہیں رک گئیں۔

”حاضر ہو سکتی ہوں سر“

”آئیے پلیز!“ میں مسکرایا۔ ”آج آپ نے دیر کر دی۔“

”بہی سر۔ وہ میری بس نکل گئی تھی۔“ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ”مزید یہ کہ لفٹ
میں بھی کچھ خرابی ہو گئی ہے۔ میں سیر حیاں چڑھ کر اُپر آئی۔ دس منٹ اس میں لگ گئے۔“
”اوہ آئی سی۔ لیکن آپ کی بس کیوں نکل گئی؟“

تیرا حسن تیرے حسن بیاں تک دیکھوں کے شوق نے مجھ سے جرح کا سلسلہ
جاری کر دئے رکھا۔

”بس سر۔ وہ“ وہ نچلی سی کھڑی تھی۔

تب میں نے دیکھا۔ سفید آنچل کے اندر اس کے لائے سیاہ بال اس کی کمر تک
آ رہے تھے۔ اور ان کے سروں پر پانی کی ننھی بوندیں ٹھہریں ہوئی تھیں۔ وہ نہا کر آئی تھی اور
شاید اسی لئے لیٹ ہو گئی تھی۔ ورنہ تو وہ ان زہریلی ٹانگوں کو ایک سخت چوٹی میں مقید رکھا
کرتی تھی۔

”مس انصاری۔ آپ کھڑی کیوں ہیں؟“ میں نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔

اس نے قدرے چونک کر میرے جانب دیکھا شاید لہجہ نرم ہونے کے ساتھ ساتھ
روٹینک بھی ہو گیا تھا۔

وہ خاموشی سے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ اور میں ٹانگوں پر جھک گیا۔



بادل بری طرح سے گھر آئے تھے۔ اور بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔ ہوا میں
ٹھنڈک، خشکی، خوشبودار سستی بھی کچھ در آیا تھا۔ یہ میرا پسندیدہ موسم تھا۔ اس موسم میں میرا جی
چاہتا میں کچی مٹی پر لیٹ جاؤں اور اس کی ساری ٹھنڈک ساری خوشبو اپنے اندر تار لوں۔
ٹی شرٹ اور ہاف جینز پہن کر میں لان میں آ گیا۔ خبرین اپنے کمرے کا دروازہ
مقتل کئے سو رہی تھی۔ یہ اس کی بد مزاجی کی بڑی دلیل تھی۔ ایسے موسم میں وہ ہمیشہ کھڑکیاں
بند کر کے پردے گرا کے سو جاتی تھی۔ بقول اس کے اسے اس اندھیرے ماحول میں گھٹن
ہوتی تھی۔

میں لان میں چہل قدمی کرتا رہا۔ کریم مجھے کافی کام تھا گیا تھا۔ موسم کا لطف
گرم گرم کافی دو بلا کر رہی تھی۔ کیا ریوں میں جھومتے گلابوں سے اٹھکیلیاں کر کے واجب
مجھ سے نگرانی تو میں جلدی سے ساری خوشبو اپنے اندر تار لیتا۔

چلتے چلتے میں مڑا تو دیکھا۔ خبرین اٹھ کر باہر آ چکی تھی۔ سیاہ شال لپیٹے وہ لان
کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ ایک تو مجھے سیارہ رنگ سے جتنی وحشت ہوتی تھی وہ اتنا ہی
اس رنگ کو اپنے ملبوسات میں جگہ دیتی۔ یہ رنگ اس کی بے روئی میں مزید اضافہ کرتا تھا۔
شاید اس کو اندازہ نہ تھا۔

”وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو۔ یہاں آ جاؤ“

میرا سوز خوشگوار تھا۔ میں نے اسے پکار لیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی مجھ تک آ گئی۔

”حیرت ہے۔ تم اتنی جلدی اٹھ گئیں۔ وہ بھی اس گھنے ہوئے ماحول میں؟“ میں

نے اسے چھیڑا۔

تم تو چاہتے ہو کہ میں موتی رہوں۔“ اس کے لہجے میں شہر پوشیدہ تھا۔

اس کے اس طنزیہ لہجے سے میرے اندر تک آگ بھڑک اٹھی تھی۔
 "کیوں بھئی۔ میں کیوں ایسا چاہوں گا؟" لازمی امر تھا کہ میرا لہجہ بھی خشک ہو

جاتا۔

"تاکہ میری غیر موجودگی میں جی بھر کر عیاشیاں کر سکو۔"
 "کیسی عیاشیاں؟" میں تنک کر اس کی جانب مڑا پھر میں نے اس کی نگاہوں کے
 تعاقب میں دیکھا۔ سامنے والے بیچلے کے ٹیرس پر دو لڑکیاں کھڑی موسم کو انجوائے کر رہی
 تھیں۔

"اوہ؟" میں نے گہری سانس لی۔
 "اب کہہ دو کہ تم نے تو انہیں ابھی ابھی دیکھا ہے؟" وہ پھر طنزیہ مسکرائی۔
 "نہیں۔" میں قلعاً سنجیدہ لہجے میں بولا۔ "میں تو انہیں پچھلے دو گھنٹوں سے تاڑ رہا

ہوں۔"

اپنی بات کا کوئی تاج سا جواب سے بغیر گلوں کو ٹھوکر سے مگراتا لہجے لیے بڑگ بھرتا
 میں اندر آ گیا۔ بڑی عجیب عورت تھی۔ اس نے زندگی میں محض ایک فن سیکھا تھا۔ خوشیوں کو
 پائل کرنا اور کرتے رہنا۔ اس سے آگے اسے کچھ علم نہ تھا۔ پیار محبت، اعتماد، اعتبار، رشتوں کا
 تقدس و احترام، وہ ہر شے سے غاری تھی۔ وہ بس اتنا جانتی تھی کہ بحیثیت ایک بیوی کے شوہر
 پر اندھا شکر کرنا اس کا حق ہے۔

میں نے کمرے سے گاڑی کی پانی لی اور باہر آ کر کسی بھی جانب دیکھے بغیر گاڑی
 نکال کر سڑکوں پر لے آیا۔ گھر سے دور رہنا اس نے میری مجبوری بنا دی تھی۔ مجھے سمجھ نہیں
 آتا تھا کہ میں کس نقطے سے اپنی زندگی کی ابتداء کروں۔ اس ڈانواں ڈول ناؤ کو کیسے متوازن
 رکھوں۔ خوشیاں کس شے سے کشید کروں۔ عمر کیسے بھر کروں؟

گاڑی لے کر میں سڑکوں پر بلا مقصد اور بنا کسی جواز کے پھر رہا تھا۔ یکا یک
 سائیز مرد میں ایک چہرہ ابھرا اور دور ہوتا چلا گیا۔ میں نے بریک لگائی اور گاڑی ریورس
 کر کے لایا۔

وہ بلاشبہ ربیبہ تھی۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں اور تھیں۔ پیپس کے پیکٹ تھامے

ہستی مسکراتی وہ غالباً موسم کا لطف اٹھانے گھر سے نکلی تھیں۔ دھانی کپڑوں میں بلا تکلف
 قہقہہ لگاتی ربیبہ۔ میرے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

"ربیبہ!" میں خود کو اسے پکارنے سے نہ روک سکا۔ وہ چوکت کر مڑی تھی۔

"سرا آپ۔" مجھے اچانک سامنے پا کر وہ ہکا بکا رو گئی۔

پھر اپنی ساتھی لڑکیوں کو قدرے پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھ آئی۔

"جی سرا!" وہ ذرا سا ہنسی۔ اسی شریٹ نے سر نکالا اور اس کے گال کے ساتھ
 ساتھ لہرانے لگی۔

"کیاں جارہی ہیں اس موسم میں؟" میں مسکرایا "کون ہیں آپ کے ساتھ؟"
 میری فرینڈز ہیں سرا۔" وہ نبھانے کیوں قہقہے سی تھی۔ "ہم یونہی ذرا گھومنے نکلے

تھے۔"

"اگر آپ کی فرینڈز سے کچھ دیر کے لئے آپ کو چھ لیا جائے تو؟"

اس نے نظریں چرائیں۔

"چلیں۔ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں۔" میں نے اس کا گریز بھانپ کر گاڑی

اشارت کر دی۔

"نہیں نہیں سرا۔ ایسی بھی بات نہیں۔" پھر اس نے مز کر انہیں آنے کا اشارہ کیا۔

"انہیں آپ باطل اتار دیں گے۔"

"ضرور!" میں نے مسکرا کر پیچھے کا لاک کھولا۔ پھر جھک کر فرنٹ ڈور کھول دیا۔

وہ گھوم کر آئی اور دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔

"آپ کی تعریف؟" پیچھے سے چنچل آواز ابھری۔

"مجھے منہ باج کہتے ہیں۔"

"میں انہی کے آفس میں تو کام کرتی ہوں۔"

ربیبہ نے مز کر وضاحت کی۔ "سرا یہ دونوں میری بہت اچھی فرینڈز ہیں۔"

پھر وہ منہ سے مخاطب ہوئی۔

"یہ سہیلکا ہیں اور یہ نانشہ۔"

”خوشی، دوئی آپ لوگوں سے مل کر۔“ میں نے رونا کہا۔
ان دونوں کو ویمین ہاسل اتار کر میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔
”آپ ہاسل میں رہتی ہیں؟“ میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔
”جی، اس نے مختصر کہا۔

”کیوں؟“
”پھر کہاں رہوں سر؟“ وہ مسکرائی۔
میں گڑبڑا سا گیا۔

”میرا مطلب ہے آپ کا گھر؟“

”میرا کوئی گھر نہیں ہے سر۔“ وہ سمجھ دیر خاموش رہ کر بولی۔ ایک والد ہی کا سہارا تھا۔ ان کے انتقال کے بعد قرض وغیرہ اتارنے کے لئے مجھے گھر بیچنا پڑا۔ کچھ عرصہ اسی رقم سے گزارا کرتی رہی۔ لیکن پھر احساس ہوا کہ کرائے کے گھر بہت مہنگے ہیں اور رقم بہت قلیل علی صاحب ہمارے پڑوسی ہیں۔ انہیں کی معرفت آپ کے آفس میں جاب بھی مل گئی اور ہاسل میں کرا بھی۔“ خدا انہیں خوش رکھے۔“

اگر علی شادی شدہ نہ ہوتا اور اپنی بیوی سے بے تحاشا محبت نہ کرتا تو شاید اس وقت میں حسد میں مبتلا ہو جاتا لیکن چونکہ میں صورت حال سے واقف تھا لہذا خوش دلی سے کار ڈائیو کرتا رہا۔

”لیکن ہم کہاں جا رہے ہیں سر؟“ اسے دفعتاً خیال آیا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔

”بے فکر رہیں۔ آج چھٹی ہے آفس نہیں جا رہے۔“

وہ دھیرے سے ہنس دی۔

”میں کام سے گھبراتی تو نہیں ہوں۔ جو آپ طنز کر رہے ہیں۔“

”نہیں میں طنز نہیں کر رہا ہوں۔ طنز سے تو مجھے سخت نفرت ہے۔“ میں بولا۔ ”ہم

سائل سمندر پر جا رہے ہیں۔“

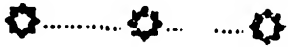
”کیوں سر؟“

”موسم انجوائے کرنے۔ کیا آپ ہاسل سے انجوائے کرنے نہیں نکلی تھیں۔“ میں

نے خوش دلی سے دریافت کیا تو وہ خاموش ہو گئی۔

وہ دن بڑا خوبصورت دن تھا۔ ہم دونوں دیر تک سمندر کے کنارے ٹہکتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔ ہنستے رہے۔ پھر میں نے اسے اچھا سا ڈنر کرایا اور رات کو آٹھ بجے ہاسل کے گیٹ کے سامنے اتار دیا۔

مجھے اندازہ ہوا تھا کہ وہ اتنی خشک نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہے۔ وہ کھلتی ملتی بھی تھی اور ہنسی مسکراتی بھی تھی لیکن اپنی ذات کی حفاظت بڑے محتاط طریقے سے کیا کرتی تھی۔ اس پوری ملاقات کے دوران مجھے اس پر ایک نگاہ انداز ڈالنے کی ہمت بھی نہ ہوئی۔ وہ واقعی ایسی لڑکی تھی جس سے محبت کی جا سکتی تھی۔



زندگی اچانک اس قدر خوش گوار ہو جائے گی میں نے کبھی گمان تک نہ کیا تھا۔
مغربین احمد نے مجھے اپنی طور پر اتنا مایوس اتنا ناکند بنا دیا تھا کہ میری تمام تر لطیف حیات مری گئی تھیں۔ اگر کبھی کبھی سرانٹا میں بھی تودہ اپنی ترش روی کے ڈنڈے بڑسا بڑسا کر انہیں دوبارہ گہری نیند سلا دیتی۔

کہتے ہیں انسان جس چیز سے بے تحاشا خوفزدہ رہے وہ ہو کر رہتی ہے۔ اسے محض یہی ایک خوف تھا کہ میری زندگی میں اس کے علاوہ کوئی دوسری عورت نہ آجائے۔ میں ہینڈ سم تھا، جوان تھا۔ اس سے شادی کر کے لکھ پتی بن چکا تھا۔ ایسے میں اس کا اندیشہ ایسا کچھ بے بنیاد بھی نہ تھا۔ لیکن میں سوچتا ہوں اگر وہ اس بات کو اپنے لئے ایک روگ نہ بنا لیتی اور اپنی دانست میں مجھے راہ راست پر رکھنے کے یہ غلط اور بے ہودہ طریقے نہ اپناتی تو شاید ایسا کبھی نہ ہوتا۔ میں تو بڑا قناعت پسند تھا۔ میں نے اسے بیوی کے روپے میں پہلے دن سے قبول کر لیا تھا۔ نہ اس سے پہلے کبھی میں نے کسی میں دلچسپی لی تھی اور نہ ہی بعد میں ایسا کچھ کرنے کا سوچا تھا۔ لیکن اس نے ذرا سے اندیشے کو اپنا روگ اور میری جڑ بن ڈالا۔ اس نے اتنی احتیاط دکھائی اتنی احتیاط دکھائی کہ بالآخر میں اس کے جوہر دم سے گھبرا کر رہیہ انصاری کی گھنٹی زلفوں کی چھاؤں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گیا۔

میں نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ میں مغربین کی جگہ کسی اور کو دوں اور نہ ہی اب ایسا

”محبت کہتے ہیں اسے جان من۔“ میں ہنسا۔ ”اور یہ ایسے ہو جاتی ہے۔ بتائے“
بتا سبھائے۔“

”مجھے ان فضول ناموں سے مت پکارا کریں۔“ وہ ناراض ہوئی۔
”کیوں؟ کیا ہرج ہے اس میں۔ زندگی ہی تو بن گئی ہو میری۔“
”تو پھر۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں خاموش ہو کر قدموں تک آتی لہر کو دیکھنے لگا۔ میں جانتا تھا اس کے لبوں پر
کس سوال نے آ کر دم توڑا تھا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر میں اسے اتنا ہی چاہنے لگا ہوں تو
پھر اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتا۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ اگر وہ میری زندگی بن گئی ہے تو
پھر دولت اب تک میری مجبوری کیوں بنی ہوئی ہے۔ میں غبرین سے بیزار ہوں تو اسے چھوڑ
کیوں نہیں دیتا تاکہ وہ اپنی زندگی بسر کرے اور میں اپنی۔

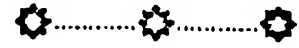
اور چونکہ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان سارے سوالات کا واحد جواب خاموشی ہے۔
لہذا میں اس سے یہ پوچھنے بغیر کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے خاموش ہی رہا۔
کبھی کبھی مجھے اس پر ترس آتا تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ میں اسے استعمال کر رہا
ہوں۔ اپنی وقتی خوشیوں کے لئے اسے اس کی آئندہ آنے والی خوشیوں سے محروم کر رہا ہوں۔
میں نے اسے سکون آور دوائی سمجھ لیا تھا۔ شراب کا جام سمجھ کر قطرہ قطرہ پی رہا
تھا۔ لیکن وہ سکون آور دوائی یا شراب کا پیالہ نہ تھی۔ وہ ایک عورت تھی۔ زندگی کی تمام تر
خواہشوں سے بھری ہوئی۔ تو میری جزوقتی خوشیوں اور ذرا سی تسکین کے لئے وہ اپنی ساری
عمر کو داؤ پر لگا رہی تھی۔

لیکن میں کرتا بھی کیا۔ وہ میری اشد ضرورت بن گئی تھی۔ مجھے یوں لگتا کہ میں
برسوں کا انہی ہوں اور وہ میری انیم کی پڑیا ہے۔ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ یہ سب برا ہے میں
اسے استعمال کرتے رہنے پر مجبور تھا۔ میں نے ایک طویل عرصے کے بعد خوشیوں کا مزا چکھا
ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اس خیال سے ہی میرے اندر نہیں نہیں کی گردان
شروع ہو جاتی تھی اور اس طاقتور آواز کو دہانا میرے بس سے باہر تھا۔



کوئی ارادہ تھا۔ میں جانتا تھا ربیعہ انصاری سے میں کسی صورت شادی نہ کر سکتا تھا۔ ایسی
صورت میں مجھے کس کس سے محروم ہونا پڑتا مجھے پوری طرح سے علم تھا۔ میرے لئے تو بس
وہ ایک شجر سایہ دار کی مانند تھی جس کی چھاؤں میں ایک تنکے ہارے مسافر کی مانند چند گھڑی
کے لئے رک گیا تھا۔ اس چھاؤں کو چھوڑ کر پتے ہوئے ریگزار میں مجھے پھر آگے بڑھنا تھا
مجھے اچھی طرح سے علم تھا۔

یہی جتنی کہ زندگی کے ان لمحات سے میں خوشیوں کا آخری قطرہ بھی کشید کر لیا چاہتا تھا۔



”مجھے تمہارے بال بہت پسند ہیں۔“ میں نے اس کے گال سے کھیتی لٹ کو انگلی
سے دھیرے سے چھوا۔ ”تم انہیں کھولتی کیوں نہیں ہو؟“
اس نے خاموشی سے لٹ پیچھے کر لی۔ میں جب بھی اسے چھو لیتا وہ براہم سی نظر
آتی تھی۔

”بادشاہ۔ تم بال کھولتی کیوں نہیں ہو؟“
”بہت گھنے ہیں ناں۔ الجھ جاتے ہیں۔“ وہ دھیرے سے بولی اور سامنے پھیلے
ہوئے سمندر کو دیکھنے لگی۔

”اور ہم جو الجھ گئے ہیں تمہاری اس لٹ میں محترمہ ربیعہ انصاری۔“ میں دھیرے
سے ہنسا۔ ”ہمیں تو آزاد کرو ناں۔“
اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”میں نے آپ کو کب کہا کہ آپ میرے قیدی ہیں۔ آپ تو آزاد ہیں۔“
”میاں اپنا قصور نہ بھی مانے میاں وہی رہتا ہے۔“
”آپ۔ آپ بہت عجیب آدمی ہیں منہاج۔“

”کیوں۔ میرے دوستنگ ہیں؟“ میں نے حیرانی سے سر پر ہاتھ پھیرا۔
”آپ نے کس طرح سے یہ سارا کھیل شروع کیا۔ میری سمجھ سے باہر ہے۔
نجانے کیسے یہ سب کچھ شروع ہو گیا۔ میں کیسے آپ سے ملنے لگی۔ ہمارے درمیان ایک
عجیب سا رشتہ کیسے پیدا ہو گیا۔ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا منہاج۔“

”سر۔ یہ پیچہ زنا ہے ہو گئے ہیں۔“

اس نے چند کاغذات میری جانب بڑھائے۔

”میں آج ذرا جلدی جانا چاہتی ہوں۔“

میں نے فائل پر سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ آج پھر اس نے آسانی رنگ کے

کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

”یہ رنگ کس کو اتنا پسند ہے؟“ میں نے اسے پھینرا۔ ”اکثر پہنتی ہو۔“

”جس کو پسند تھا اب وہ یہاں نہیں ہے۔ وہ دھیرے سے جس دی۔“ میں اس

لئے پہنتی ہوں کہ مجھے خود کو بھی یہ رنگ پسند ہے۔“

میرا دھیان اس کے پہلے پہلے میں انکا ہوا تھا۔

”جلدی کیوں جاتا ہے؟“ پھر میں نے سربھنگ کر پوچھا۔

”کچھ شاپنگ کرنی ہے۔“

”شاپنگ آفس ٹائم کے بعد نہیں ہو سکتی؟“ میرا لہجہ سنجیدہ تھا۔ مجھ سے میری محبت

کا خراج ہوں وصول کرتی ہو؟ چھٹیاں مانگ مانگ کر۔“

اس کا چہرہ یک دم تپ گیا۔ کانوں کی لوؤں تک سرخ انگارہ ہو گیا۔ پھر وہ بنا کچھ

کہے اپنی سیٹ کی جانب مڑ گئی۔

”موسم کی گزریا۔“ میں نے سوچا۔ دراصل وہ اتنی اچھی لگ رہی تھی کہ میں اسے

جانے کی اجازت دے ہی نہیں سکتا تھا۔

آفس کا ٹائم ختم ہوا تو وہ اٹھ کر اپنی چیزیں اپنے ہینڈ بیگ میں غصے سے ٹھونسنے

لگی۔ میرا کام تو سب کا ختم ہو چکا تھا۔ میں تو بے فکری سے بیٹھا اسے کام کرتا دیکھ رہا تھا۔

جب وہ اٹھ کر جانے لگی تو میں بھی کھڑا ہو گیا۔

میرے ساتھ ساتھ چلنا اس کی مجبوری بن گیا۔ لیکن باہر آ کر اس نے راستہ بدل

لیا۔ میں لفٹ کی جانب بڑھا تو وہ میزچیوں کی طرف مڑ گئی۔

میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ لیکن میں نے اسے روکا نہیں۔

ہانپتی کانپتی جب وہ لال چہرہ لائے آخری میز می پر آئی تو میں ریٹنگ سے فیک

لگائے اس کا منتظر تھا۔

”لبو کچھ سرد پڑا؟“ میں نے مسکرا کر پوچھا۔

وہ جواب دیئے بنا آگے بڑھ گئی۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ باہر نکل کر میں پارکنگ

ایریا کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے پتہ تھا اس کی مطلوبہ بس دس منٹ بعد آئی ہے۔

اطمینان سے گاڑی ڈرائیو کرتا ہوا میں اس کے قریب لے آیا اور فرنٹ ڈور کھول

دیا۔ لازمی امر تھا کہ وہ اتنے لوگوں کے سامنے تماشا بننا نہیں چاہتی تھی سو اسے بیٹھنا پڑا۔

”کہاں چلیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جنہم میں۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”نہیں بھئی۔“ میں نے ڈرنے کی اداکاری کی۔ ”اب ایسے بھی حالات نہیں۔“

”منہاج صاحب!“ اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ ”گاڑی روکیں۔“

”نہ روکیں تو؟“

تو میں دروازہ کھول کر کود جاؤں گی۔ وہ جھلائی۔

سوچ لو۔ تمہیں چوٹیں آئیں گی شاید ہاسپتال لے جانا پڑے۔ بات پھیلے گی۔

لوگوں کو پتا چلے گا کہ ہم دونوں ساتھ تھے اور ہماری ہاتھ پائی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کی بدنامی

ہوگی۔ تمہیں اس کا ڈر نہیں ہے؟“

”میں آپ کی طرح ڈر پوک نہیں ہوں۔“ وہ آنکھوں میں اترتی نمی پر قابو پانے

کی کوشش کرنے لگی۔ ”بزدل۔“ میں چند لمحوں کے لئے خاموش ہو گیا۔

”نجانے میں کیوں ہلتی ہوں آپ سے۔“ نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ وہ بڑبڑائی۔

”نہیں۔“ وہ ترخ کر بولی۔ ”میں آپ سے محبت نہیں کرتی۔“

”پھر کس سے کرتی ہو؟“ میں نے سکون سے پوچھا۔ ”اس جسے آسانی رنگ پسند ہے؟“

”ہاں۔“ مگتیر ہے وہ میرا۔“

”میرے اندر رکنی پھنا کے ہوئے۔“ لیکن میں خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا۔ میرا

اس پر کوئی حق نہ تھا۔ وہ کسی کو بھی چاہنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ میں اس سے باز پرس کا مجاز نہ

تھا۔ وہ کسی بھی لئے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے۔ میں اسے پکارنے کا جواز نہ رکھتا تھا۔ میرے

دماغ میں ان سب سوچوں نے دھواں سا بھر دیا۔

”میرے منگیتر کا نام فیصح ہے۔“ وہ میری اداسی کو محسوس کر کے دھیرے سے بولی۔

”ہوگا۔“ میں خشک لہجے میں بولا۔

”امی کے انتقال سے دو تین سال قبل ہماری متفق ہوئی تھی۔“ وہ شاید مجھے سب

کچھ بتانے کا تہیہ کر چکی تھی۔ ”وہ میری پھوپھی کا بیٹا تھا۔ اور ہمارے ساتھ ہی رہتا تھا۔ پھر اس پر کچھ بننے کی دھن سوار ہو گئی۔ اور وہ ہمیں چھوڑ کر امریکہ چلا گیا۔ کچھ عرصہ اس کے خطوط آتے رہے پھر غم ہوا کہ گرین کارڈ حاصل کرنے کے لئے اس نے وہاں کسی عورت سے شادی کر لی ہے۔“

”اور آپ اب تک اسے اپنا منگیتر سمجھتی اور پکارتی ہیں۔“ میں طنزیہ لہجے میں

بولا۔

”آپ کو تو طنز سے سخت نفرت ہے ناں۔“ وہ دھمی انداز میں بولی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔

”جینے کے لئے بہانوں کی ضرورت ہوتی ہے منہاج صاحب۔“ پھر وہ بولی۔ ”اور بہانے تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کھوکھلے اور بے جان۔ لیکن ان کے دم سے زندگی تو چلتی رہتی ہے ناں۔“

”شاید تم ٹھیک کہتی ہو ربیہ۔“

اس نے وہ سب کہا تھا جو خود میرے دل میں تھا۔ ہم دونوں دو غلیحہ و غلیحہ راستوں کے راہی تھے۔ جو اکیلے پن کے خوف سے ساتھ ہو لئے تھے۔ بلاخر کسی مقام پر ہمیں پھڑپھڑنا تھا۔ ہم دونوں ہی جانتے تھے۔

”کیا خریدو گی؟“

مارکیٹ کا رخ کرتے ہوئے میں نے پوچھا۔

”تموڈی سی خوشیاں ذرا سی بے فکری۔ چند مسکراہٹیں۔“

”میں نے اس کی سمت دیکھا اور مسکرا دیا۔ اور دکان والے کو کیا دو گی؟“

”یہی سب کچھ۔“

ہم دونوں ہی ہنس دیے۔



میں دروازہ کھول کر لاؤنج میں داخل ہوا تو ایک لمبے کے لئے چکرا سا گیا۔ چھت پر دو پاروں پر تالین پر ہر جانب پھول ہی پھول تھے۔ تازہ گلابوں کی خوشبو سے پورا گھر مہک رہا تھا۔

”کیا میں کسی اور گھر میں آ گیا ہوں۔“

چند ثانیوں کے لئے میں واقعی گھبرا گیا لیکن پھر فریچر اور دیگر چیزوں نے احساس دلایا کہ گھر اپنا ہی ہے۔ تب سے یہ سب کچھ دیکھتا ہوا میں میٹرہیاں چڑھنے لگا۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر مجھے ایک جھٹکا لگا۔ گلابوں نے یہاں بھی ڈیرا جمایا

ہوا تھا۔

اسی وقت ہاتھ روم کا دروازہ کھلا اور عزیزین گنگنائی ہوئی باہر نکلی۔ مجھے دیکھ کر مسکرا دی۔ (مجھے آنکھوں پر یقین آ گیا۔)

”آج بڑی دیر کر دی۔“ وہ کیلے بالوں کو تولیے سے خشک کر رہی تھی۔

میں نے رسٹ واج دیکھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ دیگر دنوں کی نسبت آج میں کچھ جلدی آ گیا تھا۔

”کیا بات ہے؟ یہ ایک جگہ منجمد کیوں ہو گئے؟“ وہ آئینے میں میرا عکس دیکھ کر

مسکرائی۔

”آنکھوں پر یقین آتا ہے نہ کانوں پر۔“ میں نے چنگ پر بیٹھتے ہوئے سانس

بھری۔ ”نہ یہ کمرہ مانوس نظر آتا ہے نہ تمہاری گفتگو۔“

وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”اچھا جلدی سے چیخ کر میں کھانا لگاتی ہوں جانتے ہیں آج میں نے آپ

کے لئے چائیز کھانا بنایا ہے۔“

وہ مجھ سے گفتگو کے لئے ”آپ“ کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔ حیرت سے میری

آنکھیں مزید پھیل گئیں۔

”یا خدا۔ یہ آج سورج کہاں سے نکلا تھا۔ میں نے صبح غور کیوں نہیں کیا؟“
سوچتا ہوا میں ہاتھ روم میں کھس گیا۔ نہادھو کر باہر نکلا تو وہ کھانا لگا چکی تھی۔
ہر چند کہ میں ربیعہ کے ساتھ کھانا کھا کر آیا تھا۔ لیکن ایک مرتبہ پھر کھانے بیٹھ گیا
کہ انکار کا تو آج کوئی سوال ہی نہ تھا۔

کھانے کے بعد وہ مجھے کمرے میں چلنے کا کہہ کر کافی بنانے چلی گئی۔ اس نے
سارے نوکروں کو چٹھی دی ہوئی تھی اور گھر میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہ تھا۔
میں کمرے میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ آنکھیں بند کر کے اس نئی تبدیلی کے
بارے میں سوچنے لگا۔ جو قطعاً غیر متوقع تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے ہاتھ پر نمی کا احساس ہوا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ
میرے قدموں میں بیٹھی تھی۔ سر جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ جو میرے ہاتھ کی پشت پر گر
رہے تھے۔

”غبرین۔ کیا ہوا ہے؟“ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ”یاز۔ کچھ بناؤ ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا۔“
”پاگل تو میں ہو گئی تھی منہاج۔ اپنے ہاتھوں اپنا گھر اجاڑنے چلی تھی۔“ وہ
سکی۔ ”مجھے احساس ہوا گیا ہے کہ میں غلطی پر تھی۔ پانچ سال سے آپ کی زندگی عذاب کر
رہی ہے میں نے۔ نہ صرف آپ کی بلکہ ہم دونوں کی۔ مجھے میرے رویے کی بدصورتی کا
احساس ہو گیا ہے۔ منہاج مجھے معاف کر دیں۔“

”جب تمہیں احساس ہو ہی گیا ہے۔ تو معافی کا کیا سوال؟“ میں مسکرایا اور اس کا
ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر بٹھالیا۔

”دیکھو غبرین! اب اس روش کو پھر کبھی مت اپناتا جس نے ہماری اچھی بھلی زندگی
کے پانچ بہترین سال ہم سے چھین لیے۔“

”میرا اتنا تصور ہے منہاج۔ کہ میں آپ سے انتہائی شدت سے محبت کرتی
ہوں۔ اور مجھے یہ خوف رہتا ہے کہ آپ کبھی مجھے چھوڑ کر کسی اور کو نہ اپنالیں۔“

”اور ان بے بنیاد اندیشوں پر تم بے اعتباری کی عمارت کھڑی کرتی چلی گئی۔“
”میں وعدہ کرتی ہوں میں آئندہ آپ پر کبھی شک نہیں کروں گی۔“

”میں بھی وعدہ کرتا ہوں غبرین۔ جو تمہاری جگہ ہے وہ صرف تمہاری رہے گی۔“
”پھر۔“ وہ آچھہ کہتے کہتے رہ گئی۔
”ہاں کہو۔“

”پھر ربیعہ انصاری کو فوراً سے جیستر اپنے دفتر سے نکال باہر کریں۔“

میں بششدر رہ گیا، لیکن صرف چند ثانیوں کے لئے۔ پھر میں واپس اپنی سابقہ
حالت میں لوٹ آیا۔ ربیعہ انصاری اور میرا تعلق اب کوئی راز نہ رہا تھا۔ دفتر میں۔ دفتر سے
باہر بہت سے لوگ تھے جو ہمیں کئی مقامات پر ساتھ دیکھ چکے تھے۔ ایسے میں غبرین جیسی
جاسوس فطرت عورت سے یہ بات چھپی رہنا ممکن بھی نہ تھا۔

”ربیعہ انصاری! وہ شخص ایک سایہ ہے غبرین۔“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”اس سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں
ہے۔ تمہیں۔“

”میں کسی سے خوفزدہ نہیں ہوں۔“ اس نے ناک مسکوڑی۔ ”لیکن یہ سب کچھ

ٹھیک نہیں ہے۔ منہاج۔“

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ اس مسئلے کوئی الوقت موضوع بحث نہ بناؤ۔ یہ وقت تو
اچھی اچھی باتیں کرنے کا ہے۔“

نہانے وہ کس دل سے مسکرائی تھی۔

جس طوفان کے اٹھنے سے میں دل ہی دل میں انتہائی خوفزدہ تھا وہ آ کر اس
خاموشی سے گزر جائے گا۔ میرے تصور میں بھی نہ تھا۔ میں سوچتا تھا کہ وہ ہوائی قلعے بنا کر
جنگ لڑا کرتی تھی۔ جب حقیقی قلعہ دیکھے گی تو اس کا کیا حال ہوگا۔ لیکن ہوا یوں کہ اس نے
پسپائی اختیار کر لی۔ یہ میرے لئے زندگی کی حقیقی خوشیوں کی نوید تھی۔

”کل آپ کی سالگرہ ہے۔ کیا آپ کو یاد ہے؟“ کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔

”اچھا!“ میں نے تعجب سے سوچا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا کہ آج میری سالگرہ ہے۔“

یہ اتفاق یہ اتفاقات۔“

وہ ہنس دی۔

”سچ بتاؤں منہاج! میں ماہر نفسیات سے ملتی تھی۔“

”ہائیں دو کیوں؟“ میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

”میں جانا چاہتی تھی کہ میری زندگی اس قدر بے کیف کیوں ہے۔ میرے پاس محبت کیوں نہیں ہے، خلوص، اعتبار، اعتماد سے میرا دامن کیوں اتنا خالی ہے۔ ایک ہفتے کے علاج سے ہی مجھ پر یہ بات روشن ہو گئی کہ سارا قصور میرا اپنا ہے۔ تمہیں کھودینے کے خوف کی انتہا پر جا کر میں خود بخود تمہیں کھو بیٹھی تھی۔ تم دوسروں کے دور ہے تھے۔ یہ بات سمجھ میں آتے ہی سارے کام خود بخود بنتے چلے گئے۔ اور دیکھ لو آج ہم ایک دوسرے کے کتنے قریب آ گئے ہیں۔“

”اور تم وعدہ کر چکی ہو کہ اب دور نہیں جاؤں گی۔“

”دندہ تو تم نے بھی کیا ہے ایک مجھ سے۔“ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے جلدی سے نظریں جھکا لیں۔ حبادا وہ ان میں ربیعہ انصاری کا عکس نہ پالے۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ نگاہیں تو تب جھکتی ہیں جب دل میں چور ہو۔

”چور تو تم ہو ربیعہ۔ کتنی مٹائی سے میرے دل پہ ہاتھ صاف کر گئی ہو کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ ہو کر بھی تمہیں سوچتا ہوں۔“

”کیا سوچنے لگے؟“

”آں۔“ میں چونکا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ کل میری سالگرہ ہے اور تمہد تم نے

مجھے آج دیا ہے۔ مچی خوشیوں کا تحفہ۔“

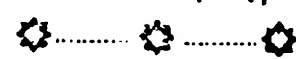
”ٹھیک ہے۔“ میں بھی مسکرا دیا۔

”کل تم آفس سے بھی چھٹی کر لو۔“

”ٹھیک۔“ مجھے حامی بھرنی پڑی۔

وہ خوش تھی اور مجھے اس کی خوشی کا پاس کرنا تھا کہ بہر حال وہ میری پہلی اور آخری

بیوی تھی۔ اور یہ فیصلہ تو میں بہت پہلے کر چکا تھا۔



دوسرا دن مصروف گزرا۔ غبرین نے مجھے پورا دن مصروف رکھا۔ صبح وہ مجھے

شاپنگ پر لے گئی۔ اور مجھے ڈھیروں ڈھیر چیزیں دلائیں۔ لُچ ہم نے ہوٹل میں کیا۔ پھر ہم گھومنے ساحل سمندر پر گئے جہاں سے رات گئے کھانا کھا کر لوٹے۔

شاید وہ شعوری طور پر مجھے ذہنی طور پر خود سے قریب کرنا چاہ رہی تھی۔ لیکن وہ پانچ سال کی کسر ایک ساتھ نکال لینا چاہتی تھی۔ جس سے میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔

رات کو تھک ہار کر جب میں بستر پر لینا تو میرا ذہن جسم کی تھیکاوٹ سے قطع نظر بالکل چوکس تھا۔ میں سوچتا چاہتا تھا۔ میں خود کو جانا چاہ رہا تھا۔ میری اپنی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں میں ربیعہ کو چاہتا تھا۔ یہ ایک قطعی بات تھی جس میں شک و شبہ کی تو کوئی بات ہی نہ تھی لیکن میں اسے اپنا نہیں سکتا تھا یہ بات تو طے تھی۔ میرے پاس جو کچھ بھی تھا وہ سب غبرین کا تھا۔ غبرین کو چھوڑ میں عرش سے فرش تک کا فاصلہ محض ایک تلابازی میں طے کرتا جو مجھے منظور نہ تھا۔ غم جہاں قابل برداشت تھا۔ غم دوراں ناقابل برداشت ہوتا اور پھر غبرین کو چھوڑ کر میں ربیعہ کو اپنا بھی لیتا تو شاید ہمارے بیچ ایسے ہی جھگڑے ہوا کرتے۔ مجھے جب جب یہ آسانشات یاد آتیں میں غیر شعوری طور پر اسے معتب غبرانا۔

یہ سب کچھ سمجھتے ہوئے ’جانتے ہوئے‘ ہوتا یہ چاہیے تھا کہ میں ربیعہ سے کنارہ کش ہو جاتا۔ لیکن کم بخت دل اس پر بھی راضی نہ ہوتا تھا۔

بہر حال ’ہونا ہی تھا۔ آج یا کل۔ مجھے ربیعہ سے علیحدہ ہونا تھا۔ اسی میں میری بہتری تھی۔ میرے بہتر مستقبل کی ضمانت تھی۔“

”آئی ایم سوری ربیعہ۔“ میں نے سونے سے قبل اس کے قصور کو مخاطب کیا۔

”یقین کرؤ اسی میں ہماری بھلائی ہے۔“



دوسرے دن وہ کچھ خاموش سی تھی۔ اس کی ٹائپ رائٹر پر تھرکتی انگلیاں بار بار رکتیں۔ وہ کچھ سوچتی اور پھر ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ شروغ ہو جاتی۔

”کہاں گم ہو؟“

وہ مجھے پیچھے بکڑانے لگی تو میں نے اس کا ہاتھ تمام لیا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا لیا۔

بچے یوں لگا اس نے مجھے ایک گہری پاتال میں دھکیل دیا ہو۔ نہیں نہیں نہیں کی گردان ایک بار پھر اسی شدت سے شروع ہو گئی۔ نجانے کیا بات تھی۔ جب میں خود ایسا سوچتا اس آواز میں اتنی شدت نہ ہوتی اور جب وہ یہ بات کرتی میں بے حال ہو جاتا۔
 ”ربیعہ۔ ربیعہ میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔“ میں بے بسی سے بولا۔

”منہاج صاحب! میں طوائف نہیں ہوں۔“

پھر وہ اپنا بیک اٹھا کر بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں پتھر کے بت کی مانند بیٹھا رہ گیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ نہ میں اسے اپنا تاتھا نہ چھوڑتا تھا۔ اور وہ اتنی خود دار تھی کہ اس نے مجھ سے آج تک اپنے منہ سے شادی کے لئے نہ کہا تھا۔

اس کی آنکھیں اس کی ناک کی بناوٹ اس کے لبوں کا کٹاؤ۔ میں نے تو پہلے دن ہی سارے انداز۔ درست لگائے تھے پھر میں غلطی پر غلطی کیوں کرتا رہا۔
 میں تجھے ہارے انداز میں اٹھا اور اپنا کوٹ اٹھا کر آفس سے نکل گیا۔



”تم نے ربیعہ سے شادی کر لی ہے؟“

یہ پہلا سوال تھا۔ جو گھر میں مجھے ہی بچہ سے کہا گیا۔ میرا داغ بھک سے اڑ گیا۔
 ”کون بکتا ہے؟“

”لوگ کہتے ہیں۔“ وہ چلائی۔ ”آخر تم اسے دفتر سے نکالتے کیوں نہیں؟“

”دفتری معاملات میں مداخلت تمہارا کام نہیں ہے۔“ میں چاہا۔ ”میں خود بہتر

جانتا ہوں مجھے کس کو رکھنا ہے۔ کس کو نکالنا ہے۔“

”منہاج! میں نے پیار محبت سے تمہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کی لیکن میں جان چکی ہوں کہ تم سدھرنے والی چیز نہیں ہو۔ آج تم دفتر مکے تو میں خوش تھی کہ واپسی پر تم مجھے اسے نکالنے کی خوشخبری دو گے لیکن پیچھے سے وہ منحوس مسز بیٹنی فون کر کے بتا رہی ہیں کہ تم نے اس چیزیل سے شادی کر لی ہے۔“

”مکھا گھونٹ دوں گا میں ان کا بھی تمہارا بھی۔“

حالانکہ میں ذہنی طور پر خود کو ربیعہ سے الگ کرنے پر تیار کر چکا تھا لیکن اس از سرفو

”سرپینز! مجھے ابھی بہت کام ہے۔“

”کیا بات ہے ربیعہ؟“

”وکی بات نہیں۔“

”اتنی اکھڑی اکھڑی کیوں ہو؟“

وہ خاموش کھڑی رہی۔

”منہاج صاحب۔“ پھر وہ بولی۔ ”میں یہ نوکری چھوڑ رہی ہوں۔“

میرے حواس پر ایک بم گرا۔

”کیوں؟“

”میں اب آپ کے ہاتھوں مزید کھلونا بننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔“

”کھلونا۔ کیا کھلونا؟“ میں پریشان ہو گیا۔ ”کیوں پسلیاں بچھو رہی ہو۔“

”آپ۔ آپ مجھے شاید ایک گڑیا سمجھتے ہیں۔ جس سے جب جی چاہا کھیل لیا۔“

جب جی چاہا اٹھا کر کونے میں ڈال دیا اور شوکیس سے دوسری گڑیا نکال لی۔

”ہاں گڑیا تو میں تمہیں سمجھتا ہوں۔“ میں نے آہستگی سے اس کا رخ اپنا جانب

موڑا۔ ”اس لئے کہ تم گنتی بالکل گڑیا جیسی ہو۔ کبھی کالج کی، کبھی موسم کی۔ اور اس وقت بالکل

پتھری گڑیا لگ رہی ہو۔ لیکن یہ کھیلنے اور ایک طرف رکھ دینے والی بات کیا ہے؟ اور یہ دوسری

گڑیا کون ہے؟“

”آپ کی بیگم محترمہ عزیزین احمد۔“ وہ تلخ لہجے میں بولی۔ ”میں نے آپ دونوں

کوک وہیں سیر کرتے دیکھا تھا جہاں آپ مجھے تلے جاتے ہیں۔ اور آپ بے حد خوش نظر

آتے تھے! آپ تو کہتے ہیں کہ آپ دونوں صرف نام کے میاں بیوی ہیں۔ آپ دونوں کے

درمیان محبت خلوص اور یقین کا کوئی رشتہ نہیں پھر وہ سب کیا تھا؟ لو برڈز کی طرح سر ملائے

کون سے وعدے وعید ہو رہے تھے؟“

”اوہ!“ میں گہری سانس بھر کر کرسی پر گر گیا۔

”میں یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“ وہ آنکھوں میں بھر آنے والے آنسوؤں کو

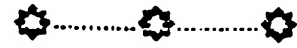
حلق میں اتارتے ہوئے بولی۔ ”میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آپ سے علیحدہ ہونا چاہتی ہوں۔“

بحث نے مجھے الجھا دیا۔ مجھے خود پر قابو نہ رہا۔

”تم۔ تم۔ تم کیا میرا گما گما گونو گے۔ کیا ہو تم جس پر اتراتے ہو۔ میں ہر چیز جھین سکتی ہوں تم سے۔ تم جانتے ہو۔“

”کیا جھین سکتی ہو تم؟ میری زندگی، میری خوشیاں؟ میری خیندیں؟ نہیں مہرین احمد! تم کچھ نہیں جھین سکتیں یہ میری مردت تھی جو میں آج تک خاموش رہا لیکن اب! میں خود چھوڑ دوں گا تمہیں۔ تمہاری دی ہوئی ہر شے کو ایک ٹھوکر مار کر واپس تمہارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ اور یقین کرو۔ ربیعہ انصاری کے ساتھ میری زندگی بہت خوشگوار گزرے گی۔“

وہ بے یقینی سے مجھے دیکھتی رہ گئی اور میں کھٹ کھٹ سیزھیاں چڑھتا اپنے کمرے میں گھس گیا۔



”زندگی تمہاری مرہون منت ان آسائشات کے بغیر بھی گزر سکتی ہے مہرین احمد۔“ میں تیار ہوتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ”ملا ہی نہ کیا ہے سوئڈ بوئڈ ہو کر ایک دیل فرسٹڈ آفس میں بیٹھنے سے۔ انسان دو روٹی کھا کر جین اور سکون کی خیند سوئے یہ کہیں بہتر ہے۔ اس سے کہ ایک لاکھ کے پلنگ پر پوری رات جاگ کر گزار دی جائے۔“

کمرے سے باہر نکل کر میں نے اس کے کمرے کے بند دروازے پر نگاہ ڈالی۔

”گڈ بائے“

میں باہر نکل آیا۔ ٹیکسی کر کے میں سیدھا ربیعہ انصاری کے ہاسٹل پہنچا تھا۔

”کس ربیعہ انصاری۔“ آفس میں بیٹھی عورت نے مجھے دیکھا۔ آپ انہیں سے ملنا چاہتے ہیں ناں۔“

”جی جی۔“ میں نے یہی نام لیا ہے۔ ”نجانے کیوں میرا اندر بہت بے چین تھا۔“

”آپ بڑے وقت پر آئے ہیں۔ وہ تو بس کرا خالی کر کے جانے ہی والی تھیں۔“

اپنا سامان تیار کر رہی ہیں وہ۔“

”اوہ! میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔“

نجانے وہ کہاں چلی جاتی اور پھر کبھی مجھے ملتی بھی یا نہیں۔ میں عین وقت پر پہنچا تھا۔

ربیعہ اندر داخل ہوئی تو وہ عورت رسا مسکرا کر باہر چلی گئی۔

”آپ!“ مجھے دیکھ کر اسے جھٹکا لگا۔ ”اس وقت۔“

”ربیعہ۔ چلو شادی کر لیں۔“

”مہر کیوں؟“ وہ ایک لمحے کے لئے گھبرا سی گئی۔

”جو آجہو ہو رہا ہے وہ میری قوت برداشت سے باہر ہے۔ اس لئے۔“

”جو آجہو ہو چکا ہے اس کا ظلم غالباً آپ کو نہیں ہے۔“ اس کا چہرہ انجانے کیوں

سرخ ہو گیا۔

”کیا ہو چکا ہے؟“ میں نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھی۔

”فسح واپس آ گیا ہے اور آج ہم دونوں شادی کر رہے ہیں۔“

میں ساکت رہ گیا۔ چند لمحوں کے لئے دماغ نے میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ الفاظ اور

معانی سب آپس میں گم نہ ہو گئے۔

”کیا۔ کیا کیا؟“

”مجھے یقین تھا۔ ایک روز وہ ضرور لوٹے گا۔“ وہ میز پر پاکی سے لکیریں کھینچنے لگی۔

”اور وہ لوٹ آیا ہے۔ صرف میرے لئے۔“

”تمہیں یقین تھا کہ وہ لوٹے گا۔“ میں حیرانی سے اس کا چہرہ ایک رہا تھا۔ ”تمہیں

یقین تھا ربیعہ اور۔ اور تم مجھ سے۔ میرے جذبات سے کیمیائی رہیں؟ اس کی محبت کی صداقت

پر اس قدر ایمان تھا تو میرے راستے کیوں کھولنے کے؟ جب تمہیں یقین تھا کہ تم میرے

لئے نہیں ہو۔ تو کیوں آئی تھیں میرے اتنے قریب؟ کیوں چھائیں میرے حواس پر؟“

”ربیعہ بی بی۔“ چونکدار نے آ کر دروازہ بجایا۔ ”باہر آپ کی گاڑی آ گئی ہے۔“

صاحب بلا تے ہیں آپ کو۔“

”منہاج صاحب۔“ وہ اپنا بیگ اٹھا کر مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”میں آپ کے ہر

سوال کا جواب دے سکتی ہوں لیکن سچ اگر الفاظ میں بیان نہ کیا جائے تب بھی سچ ہی رہتا

ہے۔ آپ غور کیجئے گا۔ ہر سوال کا جواب مل جائے گا۔“

پھر وہ مڑی اور باہر نکل گئی۔ میں ہونٹوں کی طرح ہاسٹل کے آفس میں تنہا کھڑا رہ گیا۔

”ہاں ربیعہ۔“ پھر میں نے سوچا۔ ”تم ٹھیک کہتی ہو۔ غور کرو تو ہر سوال کا بڑا واضح جواب تلخ، جواب نکلتا ہے۔ مجھے شکایت ہے کہ تم نے مجھ سے میرے جذبات سے کھیلنا یہ شکایت تم مجھ سے بہت پہلے کر چکی ہو۔ مجھے شکایت ہے کہ جب تمہاری منزل کچھ اور تھی تو تم میرے ساتھ کیوں چل رہی تھیں یہ الزام تم بھی مجھ پر عائد کر سکتی ہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لئے شجر سایہ دار تھے۔ جن کے پاس کچھ دیر ٹھہر کر سٹایا جاتا ہے۔ ان کے نیچے بیسرا نہیں کیا جاتا۔ بات بس اتنی سی ہے ربیعہ کہ ساتھ ساتھ چلنے میں تمہاری منزل پہلے آگئی اور تم نے مجھے خدا حافظ کہہ دیا۔ میری منزل قریب تھی تو میں نے بھی یہی کہنے کا سوچا تھا۔“

میں نے کھڑکی کے قریب آ کر باہر جھانکا۔ کوٹ پینٹ میں ملبوس ایک جوان اس کے ہاتھ سے اس کا بیگ لے رہا تھا۔ ربیعہ انصاری کسی رو بوٹ کی طرح اگلی سینٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی اور گاڑی آگے بڑھ گئی۔

”اور منہاج احمد! تمہاری منزل اگر پہلے آ جاتی تو۔“

میں نے ایک گہری سانس بھری اور میرے ذہن نے ابھی ابھی دیکھے گئے منظر کے لئے عنوان تجویز کیا۔

”تو۔ تم بھی تو یہی کرتے۔“

پھر میں مرا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

